ماہنامہ
اطراف
کراچی
چیف ایڈیٹر: محمود شام
انتہاؤں میں رابطہ
122
ستمبر 2024

BUSINESS VALUE ACCOUNT
PLUS

UP TO
RS.

CRORE*
Free
Inventory
Insurance

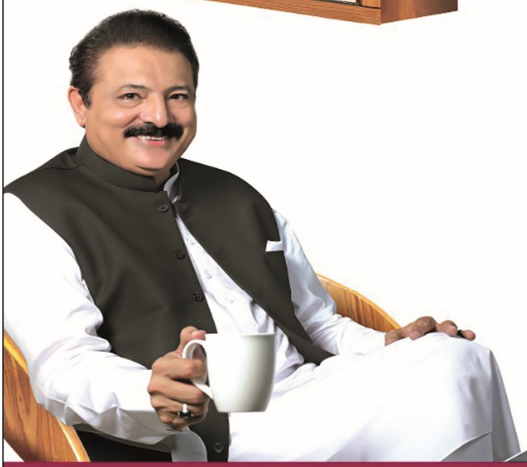

New Benefits

- Free Funds Transfer & Interbank Funds Transfer
- Free ATM Transactions from Other Banks' ATMs

Plus Benefits

- ATM Snatching Insurance
- Business Inventory Insurance
- Free Cheque Books
- Free PayPak Debit Card
- Free Pay Orders
- Free Intercity Transactions

* Terms and Conditions apply.

ZABARDAST BANK - BEMISAAL SERVICE

021-111-100-333 0301-1177777
www.silkbank.com.pk /silkbankpk SMS 9873

SILKBANK
Yes we can

باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت ABC certified

انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ

اطراف

کراچی

جلد 11 : شمارہ: 8

ستمبر 2024

قیمت فی پرچہ: 400 روپے۔ سالانہ: 4000 روپے۔ بیرون ملک ۔ 50 ڈالر

چیف ایڈیٹر : محمود شام

mahmoodshaam@gmail.com

ایڈیٹر : خان ظفر افغانی

ریذیڈنٹ ایڈیٹرز: تنویر شہزاد (لاہور)، عبدالغفور چوہدری (کینیڈا)

نگراں شعبۂ اولاد۔ تربیت۔ تواضع : رخشندہ محمود نمائندہ خصوصی : محمد اجمل (کوئٹہ)

ڈیزائن : محمد شاہد رفیق : عکاسی : شکیل قریشی : مارکیٹنگ: محمد آصف : 0331-0063311

سرکولیشن منیجر: راجہ شاہد : 0300-8210636 , 0332-2561774

ویب سائٹ اہتمام : www.launchpad.pk

پبلک اور میڈیا ریلیشنز : دی پیسج : www.thepassagepr.com

قانونی مشیر : نفیس صدیقی ایڈووکیٹ سپریم کورٹ nafislaw@cyber.net.pk

ستمبر خاص قائد اعظم کے ذاتی معالج کی بیٹی یاسمین بخاری
انٹرویو: عطرت بتول بخاری 19-22

امیر۔غریب زندگی دونوں کے لیے بے معنی کیوں؟ — اطرافیہ 05

ٹی وی ڈراما مافیا — ☆عمران سلیم 23-25

مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیوں بنا؟ — ☆سید ارتقا احمد زیدی 43-44

قومی مصنوعی ذہانت۔ موجودہ چیلنج — ☆سید عدینہ انور 07

ٹی وی ڈرامے۔ گھٹیا ڈائیلاگ — ☆ریحانہ اعجاز 27-28

اسکردو کا حسن و جمال — ☆ظہیر قندیل 47-50

ٹی وی ڈراما مافیا تجزیہ — ☆اطراف فیس بک رپورٹ 09-10

عمر کا سورج — ☆سعیدہ افضل کی آپ بیتی 29-31

ہر باپ عظیم۔ لائقِ تعظیم — رباب عائشہ، اختر شہاب، عائشہ ذکی، عادل علی، نبیلہ تبسم، ڈاکٹر محمد عظیم شاہ بخاری، سعدیہ سیما، سیدہ لبنیٰ بینش امین، نزہت جبین ضیاء، اقتدار جاوید، رُکّو انور کا اپنے عظیم والد کو خراج تحسین 60-68

جب امریکہ عالمی طاقت نہیں رہے گا — ☆فرید ذکریا 13-17

کہانی سلمٰی میرکی — ☆اطراف تحقیقی رپورٹ 32-34

کتاب 'مال گاڑی میں امانتیں' تقریب رُونمائی — ☆ اطراف رپورٹ 69-74

حسینہ واجد کے جماعت اسلامی پر مظالم — ☆ محمد وقاص خان 18

زندگی سے بڑے لوگ — ☆حسین نقی سے ڈاکٹر سید جعفر احمد کا انٹرویو 35-40

تذکرہ کتابوں کا — ☆ خان ظفر افغانی 75-77

یونیورسٹیاں	تربیت	ٹی وی ڈرامہ	حسن و زیبائش	تیمارداری	یادداشتیں
لائبریریاں	سائنسی ادارے	معیشت	سیاحت	مشترکہ خاندان	بین الاقوامی کتابیں

ایڈیٹر پبلشر: طارق محمود شام۔ پرنٹر: اسلم ذکی عائشہ پرنٹرز۔ مقام اشاعت: اے 262 بلاک 3 گلشن اقبال کراچی۔

خط و کتابت صرف اس پتے پر: اے 262، بلاک 3 گلشن اقبال، کراچی۔ فون: 0300-8210636

ای میل: Mahmoodshaam@gmail.com ویب سائٹ: www.atraafmagazine.com

kundun

Now Introduces 3 - 5 Pieces New Design Trolly Bags With Small Beauty Case Different Colour
Original Fiber Material JIAN LUGGAGE Is The Best Way For Travelling

Also Deals in Shawls , Kashmir Shalws, Pashmina, Embroidery
Shahtoosh, Kalamkar & Jamawar

Address: Adullah Haroon Road Opp. Hotel Metropole.
Ph: +92 21 35686641-42 Fax: +92 21 35684349

اطرافیہ

امیر۔غریب زندگی دونوں کے لیے بے معنی کیوں؟

پاکستان کے سب سے بڑے صنعتی۔تجارتی مرکز کے ایک امیر ترین علاقے محمد علی سوسائٹی میں صرف ایک قیمتی گاڑی نے بے قابو ہو کر موٹر سائیکل پر سوار باپ بیٹی سے زندگی نہیں چھینی ہے۔ایک پورا سماج بے قابو ہوا ہے۔ایک طبقے نے دوسرے طبقے کی بے بسی پر حملہ کیا ہے۔دولت کا نشہ بھی ہلاکت خیز ہے۔اس میں اگر جدید منشیات کا استعمال بھی بڑھ جائے تو انسانیت کی پامالی ناگزیر ہوتی ہے۔

زندگی اللہ تعالیٰ کی سب سے قیمتی نعمت ہے۔سب سے حسین تحفہ۔

ہم پاکستانی واہگہ سے گوادر تک۔امیر ہوں۔یا غریب۔وڈیرے ہوں کہ ہاری۔چوہدری ہوں کہ کسان۔مل مالک ہوں کہ مزدور۔میڈیا سیٹھ ہوں کہ میڈیا کارکن۔زندگی سے بے گانہ کیوں ہوتے جارہے ہیں۔اپنی زندگی کی قدر کررہے ہیں نہ دوسروں کو زندہ رہنے دے رہے ہیں۔

1985 کے غیر جماعتی انتخابات کا انعقاد حکمران طبقوں کا ایک بہت سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔اس سے جمہوریت عوام کے لیے۔عوام پر عوام کی حکومت کے نظریے کو دفن کرنا مقصود تھا۔1977 جولائی میں ایک منتخب حکومت کا سلسلہ ختم کرکے جس غیر سیاسی۔غیر جماعتی۔غیر آئینی۔غیر اخلاقی حکمرانی کا تجربہ کیا گیا۔اس سے جیسے بیمار۔معذور۔اپاہج سماج کا قیام مقصود تھا۔یہ کار ساز المیہ اسی کا ایک منطقی اور تاریخی مظہر تھا۔فوجی حکمرانوں نے جن نو دولتیے خاندانوں کے ہاتھ میں اس عظیم مملکت کی قیادت سونپی۔ان گھرانوں میں موقع پرستی۔ابن الوقتی۔جائز ناجائز طریقے سے سرمائے کا حصول غالب تھا۔وہی پورے سماج کی چال بن گئی۔جھوٹ کو سیاسی بیان۔اخلاقیات کو کنزوری۔حرف و دانش کو بے نتیجہ قرار دیا گیا۔منافقانہ طرز زندگی کو فروغ دیا گیا۔مقامی اور عالمی اسٹیبلشمنٹ کے گماشتے اپنے آپ کو عقل کل قرار دینے لگے۔مذہب کو اپنی غیر آئینی حکمرانی۔جاگیرداروں۔سرداروں اور سرمایہ داروں کے لیے استعمال کیا گیا۔بتدریج مینوفیکچرنگ ختم کرکے ملک کو غیر ممالک کی مصنوعات کی منڈی بنایا گیا۔عدالتوں سے انصاف کی فراہمی مہنگی سے مہنگی کردی گئی۔شریف لوگ تھانہ کچہری سے ڈرنے لگے۔غربت کی لکیر سے ہر سال لاکھوں پاکستانی نیچے جاتے رہے۔تعلیم کو انہی چار دہائیوں میں کاروبار بنادیا گیا۔

غریب مائیں ہوں یا امیر۔ایسے انسانوں کو جنم دیتی رہیں۔جو زندگی سے بیگانگی۔اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار سے بیزاری کو اپنا طرز فکر بنانے پر مجبور رہنے لگے۔میڈیا نے دانشوروں نے اسکالرز نے۔مذہب کے سوداگروں نے انسانیت کے وقار کو بلند کرنے کی بجائے غریب اکثریت کو یہ باور کروایا کہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم عین قدرتی اور فطری ہے۔معاشرے میں عدم توازن کوئی مسئلہ نہیں ہے۔اس ساری فکری تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بااختیار۔وسائل پر قابض طبقہ اسے اپنا قدرتی حق سمجھنے لگا۔اس کے لیے بھی ایک متوازن سماج بے معنی ہوگیا اور پاکستان کی آبادی کی اکثریت اپنے آپ کو۔اپنی اولادوں کو ملک پر بوجھ سمجھنے لگی۔اس کے لیے اپنی زندگی بے معنی ہوگئی۔دولت۔زمین اور املاک امیر اور غریب دونوں کے لیے اتنی اہمیت اختیار کرگئیں کہ وہ پورے معاشرے کو متوازن بنانے کی بجائے صرف اپنے آپ کو آسودہ حال بنانے کے لیے رشتوں کا احترام بھی ختم کرنے لگے۔گزشتہ چار دہائیوں میں سرمائے اور اختیار کے حصول کی خاطر غربا میں بھی سگے باپ ماں بھائی کے قتل کی وارداتیں بڑھی ہیں بڑے خاندانوں میں بھی۔چاہے جاگیردار ہوں صنعت کار۔سرمایہ کار۔علمائے دین۔بیٹے باپ کو قتل کررہے ہیں۔قتل کروا رہے ہیں۔

ایک سماج میں توازن رکھنے کے لیے بنیادی کردار پولیس اسٹیشن۔میونسپل اداروں اور ذیلی عدالتوں کا ہوتا ہے۔پولیس اسٹیشن جرائم کی سرپرستی کررہے ہیں۔میونسپل اداروں کے اختیارات چھین لیے گئے ہیں۔ذیلی عدالتوں میں ٹاؤٹوں کا راج ہے۔اس سے ایک سماج کی یہی ذہنی اور روحانی کیفیت ہوسکتی ہے۔غربا کے جسم صحت مند ہیں نہ ذہن۔امرا کے جسم ہزار خوبصورت اور متوازن لگیں۔وہاں ذہن بہت بیمار۔اور محسوسات بہت گھٹیا ہیں۔

ذہنی امراض کے ماہرین کہتے ہیں کہ پاکستان میں ذہنی بیماروں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔سکون آور دواؤں کا استعمال امیر غریب سب کررہے ہیں۔شہر شہر غریب فلائی اوورز کے نیچے۔قبرستانوں میں سستا نشہ کرکے آس پاس سے بے خبر ہورہے ہیں۔وہ بھی زندگی کو بے معنی خیال کررہے ہیں۔ہر شہر کے پوش علاقوں میں امرا۔دولت کے نشے کے ساتھ ساتھ جدید مہنگی منشیات کا استعمال۔مرتبے کا نشان بن رہا ہے۔بڑے فخر سے بتایا جاتا ہے کہ میاں بیوی دونوں ڈرگز استعمال کرتے ہیں۔بزرگوں کا احترام ختم ہورہا ہے۔میڈیا کے ٹاک شوز۔ڈرامے بدزبانی اور گستاخی کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ ہم ایک بیمار معاشرے کے رہائشی ہیں۔حکمراں۔دانشور۔علما۔میڈیا۔ریاستی ادارے۔عدلیہ۔مقننہ سب اس کے ذمہ دار ہیں۔ایک ادارہ دوسرے کے اختیارات میں مداخلت کررہا ہے۔دولت اختیار کی اور اختیار دولت کی بنیاد ہے۔سب کو اپنے اس مجرمانہ کردار کا احساس بھی ہے۔اس لیے ذہنی آسودگی نہیں ہے۔سڑکوں پر۔عدالتوں میں۔سیکرٹریٹ میں غریب خاندانوں اصولوں اور اقدار کو روندا جارہا ہے۔زندگی جیسی نعمت بے معنی ہورہی ہے۔

محمود شام

کفالتِ یتیم سے ۔۔۔ جنت کا حصول بھی ۔۔۔ رفاقتِ رسول ﷺ بھی
الخدمت
ALKHIDMAT
الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان
ALKHIDMAT FOUNDATION PAKISTAN
AGHOSH COLLEGE
دُعاء
تقدیر بدلنے کا فن جانتی ہے
تو کیا ہی افضل ہو کسی یتیم کی دُعا لے لی جائے
آپ بھی زکوٰۃ و عطیات دے کر شامل ہو جائیں ۔۔۔ لاکھوں دُعاؤں میں
زکوٰۃ اور عطیات کے لیے
زکوٰۃ میزان بینک 02140101095120
عطیات میزان بینک 02140100861151
0800 44448
www.alkhidmat.org/give

قومی مصنوعی ذہانت۔ نئے امکانات

آج کے ڈیجیٹل دور میں کوئی ملک بھی اس ٹیکنالوجی کو اپنائے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہماری نئی نسل کو اس ٹیکنالوجی کے اسرار و رموز سے زیادہ سے زیادہ آگاہ کیا جائے۔ جواں سال اور جواں عزم سیدہ عدینہ انور سافٹ ویئر آرٹی فیشل انٹلی جنس انجینئر ہیں۔ اس ٹیکنالوجی پر عبور حاصل کر رہی ہیں۔ ہماری درخواست پر 'اطراف' کے لیے ایک تعارفی تحریر سے نواز رہی ہیں۔ ہم نے گزارش کی کہ وہ قارئین 'اطراف' کو آئندہ بھی اس شعبے سے با خبر رکھنے کے لیے لکھتی رہیں۔ انہوں نے SSUET کراچی سے 2024 میں 4 سالہ بیچلر ڈگری کورس میں کامیابی حاصل کی ہے۔

مصنوعی ذہانت ٹیکنالوجی نئے چیلنجوں کا مقابلہ

سیدہ عدینہ انور۔ سافٹ ویئر انجینئر

مئی 2023 میں، وزارت اطلاعات و مواصلات نے پاکستان کی پہلی قومی مصنوعی ذہانت (AI) پالیسی کا مسودہ پیش کیا۔ اس پالیسی کا مقصد پاکستان کو عالمی AI ٹیکنالوجی کے رجحانات کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہے، تاکہ ملک کو ایک مسابقتی برتری حاصل ہو۔ پالیسی چار اہم ستونوں پر مرکوز ہے: AI مارکیٹ کو فروغ دینا، AI کے لیے آگاہی اور تیاری، ایک ترقی پسند اور قابل اعتماد ماحول تخلیق کرنا، اور تبدیلی اور ترقی حاصل کرنا۔

پالیسی کے مسودے میں چند چیلنجز شامل ہیں۔ سب سے پہلے، قابل پیمائش مقاصد اور واضح عملدرآمد کی حکمت عملیوں کی ضرورت ہے، جو AI کے انضمام کو مؤثر بنا سکتی ہیں۔ اخلاقی پہلوؤں اور واضح ہدایات بھی ضروری ہیں، جو AI ٹیکنالوجی کو ذمہ داری سے اور محفوظ طریقے سے استعمال کرنے میں مدد کریں گی۔ پالیسی کے ستونوں کی ہم آہنگی کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے تاکہ ایک منظم نقطۂ نظر حاصل ہو۔

ملکی موجودہ صورتحال کے تحت، عوام مختلف شعبوں یا عمر کی بنیاد پر AI کو کس طرح اپنا سکتی ہے:

- اسکول اور کالج کے نصاب میں AI کی بنیادیات شامل کی جائیں، تاکہ طلباء AI کے تصورات اور استعلالات کو سمجھ سکیں۔
- خود سیکھنے کی اہمیت ہے، اور صدارتی مصنوعی ذہانت و کمپیوٹنگ (PIAIC) اور گورنر سندھ آئی ٹی انیشیٹو کے کورسز افراد کو AI میں مہارت حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ یہ کورسز لوگوں کو AI کی مہارتیں ترقی دینے اور تیزی سے ترقی پذیر تکنیکی منظرنامے میں متحرک رکھنے میں مدد کرتی ہیں۔
- کاروباری ادارے اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے AI کا استعمال کریں۔ AI تجزیات اور خودکار کارکردگی اور فیصلے سازی میں بہتری لا سکتی ہیں۔ کمپنیاں ایسے AI-based حل اپنائیں جو ان کی صنعت کی مخصوص ضروریات کو پورا کرتی ہوں۔
- تحقیق و ترقی کے لیے مشترکہ منصوبے اور شراکت داریوں کی حمایت کریں۔ تحقیقاتی ادارے قومی AI اقدامات کے ہم آہنگ میں علم اور مہارت کا تبادلہ کریں۔

اسکولوں کالجوں میں مصنوعی ذہانت نصاب میں شامل کی جائے

موجودہ AI پالیسی کا فریم ورک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے، اور کچھ اضافی اقدامات اور حکمت عملی کے ساتھ، AI ملک کے تمام شعبوں میں اپنا مقام قائم کر سکتی ہے۔ طلباء، کمپنیاں، اور تحقیقاتی ادارے AI کے فوائد کو اپنی

طلبہ۔ کمپنیاں اور تحقیقاتی ادارے مصنوعی ذہانت سے زندگی کے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں

زندگیوں میں شامل کر کے اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں اور پاکستان کو ایک نئے تکنیکی دور میں لے جا سکتے ہیں۔

In May 2023, the Ministry of Information and Telecommunications unveiled Pakistan's first national Artificial Intelligence (AI) policy draft. The aim of this policy is to align Pakistan with global trends in AI technology, providing the country with a competitive edge. The policy focuses on four key pillars: facilitating the AI market, awareness and preparedness for AI, creating a progressive and trustworthy environment, and achieving transformation and evolution.

The policy draft includes several challenges that could hinder the seamless integration of AI into various aspects of the country. Firstly, there is a need for measurable objectives and clear implementation strategies, which could make AI integration more effective. Ethical considerations and clear guidelines are also necessary, which will help in using AI technology responsibly and safely. The alignment of the policy's pillars could also be reviewed for a more organized approach.

Under the current situation of the country. Here is how the public can adapt AI regardless of being in any field or age:

AI fundamentals should be incorporated into school and college curricula, allowing students to understand AI concepts and applications. Additionally, self-learning AI is crucial at any age in Pakistan, and the Presidential Initiative for Artificial Intelligence & Computing (PIAIC) and the Governor Sindh IT Initiative course provide opportunities for individuals to gain expertise in this field. These courses enable the people of Pakistan to develop AI skills and stay relevant in a rapidly evolving technological landscape.

Businesses should use AI to improve their operations. AI analytics and automation can enhance performance and decision-making. Companies should also adopt AI-based solutions that meet their industry's specific needs.

Support collaborative projects and partnerships for AI research and development. Research institutions should exchange knowledge and expertise in alignment with national AI initiatives.

AI technology has the potential to open new opportunities and avenues for growth in Pakistan. The current AI policy framework provides a strong foundation, and with some additional measures and strategic adjustments, AI can establish its presence across all sectors of the country. Students, individuals, companies, and research institutions can all integrate the benefits of AI into their lives to achieve their goals and lead Pakistan into a new technological era.

میں نے پرائمری تعلیم کس اسکول میں حاصل کی؟

ماہنامہ

اطراف

کراچی

کی ایک اور منفرد۔ خصوصی پیشکش

آپ اب بھی اپنی یادیں بھیج سکتے ہیں

واٹس ایپ: 0300-8210636

ڈاک سے: A-262، بلاک 3، نفیس اقبال۔ کراچی

ای میل: Mahmoodshaam@gmail.com

پاکستان کی پرائمری تعلیم کی تاریخ دردمند پاکستانیوں کی زبانی

اکتوبر 2024 میں اشاعت خاص

پاکستان کے گوشے گوشے سے اور سمندر پار پاکستانیوں کی عنایات

اب تک موصول ہونے والی تحریریں

1۔ درشہوار قادری — برطانیہ
2۔ ڈاکٹر نعمان احمد — این ای ڈی
3۔ نظیرہ اعظم — واشنگٹن
4۔ قدرت اللہ شہزاد — بہاولپور
5۔ حسن راشد — حیدرآباد
6۔ عفت سلطانہ — کراچی
7۔ الطاف احمد — کراچی
8۔ انجم عثمان — کراچی
9۔ تنویر شہزاد — لاہور
10۔ منزہ سہام مرزا — کراچی
11۔ آفتاب میمن — کراچی
12۔ مقبول خان — کراچی
13۔ کرن فرشوری — کراچی
14۔ حرا شبیر — کراچی
15۔ رمضان بلوچ — کراچی
16۔ جویریہ یاسمین — میرپور، آزاد کشمیر
17۔ عبدالرشید — کراچی
18۔ فخر عالم قریشی — گلگت بلتستان
19۔ محمد حسین — ریڈیو پاکستان حیدرآباد
20۔ محمد یعقوب — حیدرآباد
21۔ شبنم گل — حیدرآباد
22۔ میر حسین علی امام — کراچی
23۔ اسماء مشتاق — اسلام آباد
24۔ ڈاکٹر رئیس صمدانی — کراچی
25۔ پروفیسر پرویز احمد — پٹارو
26۔ زیب سندھی — حیدرآباد
27۔ پروفیسر محمد نجیب خان لودھی — حیدرآباد
28۔ شاہین رشید — کراچی
29۔ نازیہ آصف — گجرات
30۔ انجم جاوید — کراچی
31۔ فہیم صدیقی — کراچی
32۔ احمد جاوید — دہلی (بھارت)
33۔ پروفیسر ڈاکٹر انور شاہین — کراچی
34۔ نذیر خالد — لاہور
35۔ جبار مرزا — اسلام آباد
36۔ پروفیسر شاداب احمد صدیقی — حیدرآباد
37۔ حفیظ اللہ خان — کوئٹہ
38۔ ڈاکٹر رضوانہ انصاری — حیدرآباد
39۔ رانا شاہد — بوریوالہ
40۔ شہزاد نیاز — کراچی

ٹی وی ڈراما مافیا تجزیہ

’اطراف‘ کی طرف سے ’فیس بک‘ پر دریافت کیا گیا تھا۔

’’آپ کو کون سا ڈراما پسند ہے؟ آپ کے گھر والے کونسا ڈراما پسند کرتے ہیں اور کیوں؟‘‘

اس سلسلے میں جو تجاویز تبصرے آئے ہیں وہ نذر قارئین ہیں۔ آپ بھی اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔

واٹس ایپ: **0300-8210636**

آج کل آپ کے گھر میں کون سا ٹی وی ڈرامہ دیکھا جا رہا ہے؟
آپ کون سا ڈرامہ پسند کرتے ہیں؟
آپ کے گھر والے کون سا ڈرامہ پسند کرتے ہیں اور کیوں؟
ٹی وی ڈراما مافیا - اطراف نے ہر ماہ بے باک تجزیہ شروع کر دیا

پی ٹی وی کے ڈراموں کے بعد ڈرامے نہیں دیکھے

افسانہ نگار۔شاعر۔دانش ور۔اسکالر کیا کہتے ہیں

☆اطراف فیس بک سروے

امتیاز خان: نادانیاں۔اور بلبلے۔

دائود عزیز مسعودی: جنٹلمین۔

فرحین چوہدری: میرے گھر میں 12 سال سے ٹی وی لگا ہی نہیں۔

ڈرامے مخصوص گھرانوں کے اور کہانی یکساں

مسعود قریشی: ہم نے اپنے گھر میں ٹی وی ڈرامے دیکھنے بند کر دیے ہیں۔ ہمیں پی ٹی وی کے ڈرامے اچھے لگتے تھے۔اب نہ کوئی کہانی نہ مزاح۔ بہت ہی گھٹیا ڈرامے۔

ناہید عزمی: یقین کیجئے برسوں ہو گئے کوئی ڈراما دیکھے۔

نسیم انجم: اتفاق ایسا ہے ایک طویل عرصہ گزر رہا ہے میں نے ڈرامے دیکھنے چھوڑ دیے ہیں۔

مریم ارشد: ہم ٹی وی ڈرامہ نہیں دیکھتے۔

اشرف مدراس والا: فضول ترین دَور ہے۔ ڈرامے یکسانیت اور مخصوص گھرانوں کے بچے بنا رہے ہیں۔ الحمدللہ پاکستانی چینلز دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

طارق جامی: ٹی وی ڈرامے اب غیر حقیقی موضوعات و مصنوعی ماحول کے ترجمان ہیں گھر پر ٹی وی اب کم ہی کھولا جاتا ہے۔

تسنیم منظور علی: حسینہ معین فاطمہ بیجا انور مقصود کے ڈرامے ہی دیکھے ہیں اب تو معلوم بھی نہیں کہ کس چینل سے کون سا ڈرامہ آرہا ہے بلکہ اب ٹی وی ہی نہیں دیکھتے۔

پرویز جمالی: دُعا اور پروان۔ گرین چینل کا ڈراما۔

زبیر احمد مدنی: پاکستانی ڈرامے پاکستانی فلموں کی طرح اس وقت تک بہت اچھے رہے جب تک ان پر کراچی کا غلبہ رہا۔ جونہی یہ لاہور کی طرف منتقل ہوئے سب کچھ برباد ہو گیا۔ آج شرفاء کے گھروں میں سارا کنبہ اکٹھا بیٹھ کر یہ ڈرامے دیکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

شگفتہ فرحت: ہمارے ملک کی سیاست میں اتنے ڈرامے ہو رہے ہیں کہ وہی بلا ناغہ دیکھتے ہیں کیونکہ حکومتیں بنتی ہیں لیکن کام کچھ بھی نہیں ہوتا سوائے ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے کے۔ یہ ڈرامے اب عوام بھی بہت دلچسپی سے دیکھنے لگے ہیں۔

فرید سرور جعفری: کسی دور میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انور مقصود، حسینہ معین، فاطمہ ثریا بجیا کے تحریر کردہ ڈرامے شوق سے دیکھتے تھے تاہم اب پاکستانی ڈراموں میں لچر پن کے سوا کچھ بھی نہیں دکھایا جاتا۔ اس لئے صرف ’جیو‘ پر عثمان اور ’ہم‘ پر صلاح الدین ایوبی دیکھتے ہیں۔ یونس ایمرے بھی دیکھا۔

مہ جبین عارف: اب تک ’’خوشبو میں بسے خط‘‘ دیکھ رہے تھے۔

محمد ظہیر قندیل: آپ نے ڈرامہ اور ڈراما دونوں طرح لکھا ہے جبکہ درست املا ڈراما ہے۔

صفدر صدیق رضی: پچھلے 35 برس سے تا حال کوئی ڈراما نہیں دیکھا۔

شاھانہ جاوید: ہم ہر ڈراما دیکھتے ہیں لیکن وقت گزاری کو۔

صائمہ اسحاق: آج کل کوئی ڈراما نہیں دیکھ رہے۔

سیما لیاقت: اب ڈراموں میں کہانی کہاں، عجب معاملات ہیں۔ ڈرامے آپ کے عہد کی سماجی اقدار کی رسومات کی حتیٰ کہ پہناوے کی بھی عکاسی کرتے تھے۔ ہمیں تو آج تک اکابوا کا کردار

اب پاکستانی ڈراموں میں لچر پن کے سوا کچھ نہیں

بہت پیار کے ساتھ یاد ہے۔ آج کے ڈراموں میں کچھ نظر نہیں آتا۔ افسوس ہوتا ہے کہ ایک ہی خاتون کے پیچھے خاندان کے دیگر رشتے بھی پڑے ہوتے ہیں۔ بلکہ اے آر وائی کے ڈراموں میں تو زیادہ تر یہی دکھایا جاتا ہے۔ کچھ دن پہلے ڈراما ’اس پیار کے صدقے‘ غالباً ہم چینل پر آیا تھا۔ اس میں بھی بہو پر دل آجاتا ہے۔ البتہ وہ ڈراما صرف اس لیے دیکھا کہ دو کنڈیشن لڑکا لڑکی کی اتفاقاً شادی ہو جاتی ہے۔ بس یہی وجہ دلچسپی تھی۔ پچھلے دنوں خواتین میں ’بے بی باجی‘ ڈراما بہت مقبول ہوا اس میں خاندان اور اس کے مسائل دکھائے گئے تھے۔ ڈراموں میں کوئی مقصد ہو۔ یہاں کوئی مقصد بھی تو نہیں۔ اور ہاں ربر کی طرح ڈراما لمبا کر دیتے ہیں۔ ان ڈراموں میں بجلی گیس پانی نوکری کوئی بھی مسئلہ نہیں ہوتا پتا نہیں کس کی عکاسی کرتے ہیں۔

نعمانہ شیخ: ہم نے ڈرامے دیکھنا چھوڑ دیے ہیں۔

محمد عماد الدین: ’’تنہائیاں‘‘۔ ❁

ٹی وی ڈراما مافیا بے نقاب

ہم نے فیس بک پر درخواست کی۔
''آیئے اس مافیا کو مل جل کر بے نقاب کریں۔
'اطراف' ہر ماہ ان ڈراموں کی بے مقصدیت کا پردہ چاک کرے گا
آپ بھی ہمارا ساتھ دیں۔ آپ بھی جو دل میں آتا ہے لکھیں۔''
بہت سے کرم فرماؤں نے اپنے دل کی بات سے مطلع کیا۔
پڑھیے آپ بھی اپنی رائے دے سکتے ہیں۔

آیئے اس مافیا کو مل جل کر بے نقاب کریں
اطراف ہر ماہ ان ڈراموں کی بے مقصدیت کا پردہ چاک کرے گا
آپ بھی ہمارا ساتھ دیں۔ آپ بھی جو دل میں آتا ہے لکھ کر بھیجیں
ٹی وی ڈراما مافیا کے پہلے مضمون کا لنک کمنٹس باکس سے حاصل کریں

بے ہودہ مکالمے۔ بدتہذیبی

دانش ور۔ مصنف۔ پروفیسر۔ قلم کاروں کی قیمتی رائے

☆ اطراف فیس بک سروے

تنویر شوکت: ایک منصوبے کے تحت دکھائے جانے والے ڈراموں کے ذریعے ہماری نئی نسل کی ذہن سازی کی جارہی ہے ہماری تہذیب، اخلاق اور تشخص تباہ کردیا گیا ہے۔

ناھید عزمی: احسن اقدام۔ یہ وقت کی ضرورت بھی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو بجلی اور اس کے ٹیرف پر بھی آواز بلند کریں۔

بشیر خان: چند لوگ ڈرائنگ روم میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور بولتے رہتے ہیں سو قسطیں گزر جاتی ہیں پھر بھی ڈراما ختم نہیں ہوتا۔

غزالہ خالد: بہترین موضوع ہے۔

حسن علی ٹیپو: یہ بحث معاشرے کی اہم خدمت ہوگی۔

ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت نئی نسل کا اخلاق تباہ کیا جارہا ہے

حاجی محمد سہیل خان: ڈرامے کیا ہیں ایک ڈرامے میں مردانے جو کردار کیا ہوتا ہے دوسرے ڈرامے میں وہ کردار خاتون سے کروا کر دوسرا ڈراما تخلیق کرنے کا نام دیتے ہیں اسکرپٹ میں بیہودہ مکالمے سرمایہ دارانہ نظام کراچی جاگیردارانہ نظام سندھ یک جا کر کے بزور طاقت ایک پڑھے لکھے شخص کی بیٹی کو اٹھانے والے کو ہیرو ثابت کرنے کی کوشش اور دوسرے ڈرامے دیہات سے پڑھنے کیلئے آنے والی کیساتھ شہری لڑکے کی بدتہذیبی۔

زبیری خان حسن زئی: بہت ہی اچھی کاوش ہے۔ آج کل ڈرامے نہیں بس اپنی گھر کی کہانیاں نشر کرتے ہیں۔

ہمیں اپنی روایات اور ثقافت کو بچانا ہوگا

مسعود قریشی: ڈراموں پر سخت سنسر شپ ہونی چاہئے ہمارے معاشرتی اور مذہبی شعائر کی حدود عبور کی جارہی ہیں۔

عارف نذیر: بہترین کاوش ہے آپ کی۔ آج کل کے ڈرامے بیہودگی کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ سبق آموز ڈرامے بنا کرتے تھے جو پوری فیملی کے ساتھ مل کر دیکھا جاتا تھا۔

سیدہ عائشہ: سرجی یہ تو ایک بہت ہی نیک اقدام ہے۔ ماشاءاللہ۔

سید عنایت شاہ: ضرورت ہے اپنی روایات اور ثقافت کے تحفظ کی۔

قدسیہ ملک: بہت اچھی کاوش ہے لیکن مضمون لکھ کے کہاں سینڈ کرنا ہے پلیز اس کے بارے میں بھی بتا دیں تو ہماری رہنمائی ہو جائے گی۔ واٹس ایپ۔ 0300-8210636۔

خالد خان: ایمان کی بگاڑ کا ہے۔

اطہر علی: اچھا اقدام ہے۔ مگر پوسٹ پر صرف درشہوار کی تصویر لگانے کی کوئی خاص وجہ:

معاشرتی اور مذہبی حدود پار کی جارہی ہیں

نوازش شیرازی: مدت ہوئی ٹی وی ڈرامے دیکھنا چھوڑ ہی دیا ہے۔ کل ہی مجھے خیال آیا کہ ٹی وی پر بچا ہی کیا ہے۔

ولی الرحمن: تصویر تو ایسی لگائی ہے جیسے پروموشن کر رہے ہیں۔ اور لکھا جارہا ہے پردہ فاش کرنے کے بارے میں۔ عجیب۔

طالب مرزا پوری: قابل قدر کاوش۔ ماشاءاللہ ہم سب آپ کے سنگ۔ ❀

قارئین کے خطوط

السلام علیکم اطراف

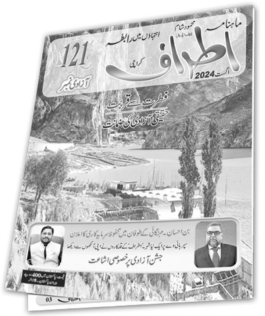

ہوسِ اقتدار کب ختم ہوگی

ان کی ہوس اقتدار ختم ہی نہیں ہوتی۔ 2008 جب پی پی پی وفاقی سطح پر برسرِ اقتدار آئی تو اس جماعت نے جنرل پرویز مشرف کے عہد میں آئینی ترمیم جس کی رو سے کوئی شخص تیسری مرتبہ وزیر اعظم نہیں بن سکتا کو ختم کیا۔ اگر اس آئینی ترمیم کو برقرار رہنے دیا جاتا تو جن کی ہوسِ اقتدار کا آپ شکوہ کررہے ہیں وہ آئینی طور پر ختم ہوچکی ہوتی۔

جنرل محمد ضیاء الحق کو معصوم عن الخطاء ثابت کرنا مقصود نہیں لیکن جو اچھے کام انہوں نے کیے وہ جماعت جو ان کا نام سننا گوارا نہیں کرتی وہ بھی ختم نہ کرسکی۔ بلکہ اگر چہ نقل کے طور پر سہی، پھر بھی جاری ہیں ایک یہ کہ کسی بھی قومی منصوبے کا سنگِ بنیاد یا افتتاح کرتے وقت دعائے خیر مانگنا۔ اس قابل ستائش عمل (دعا مومن کا ہتھیار ہے۔ حدیث) کا قیام جنرل محمد ضیاء الحق کے عہد سے قبل نہ تھا۔ اگر چہ متعدد بہتریاں لانے کی ضرورت ہے، نظام زکوٰۃ کو پی پی پی نے ختم نہ کیا۔

موافق اور مخالف حلقہ تعلقات کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پہ نظر رہنی چاہئے۔ مغربی ممالک بشمول امریکہ وہاں جمہوریت زیادہ تر حالات میں اپنے حسن عمل کے باعث ان کے سیاسی استحکام کا باعث ہے۔ پاکستان میں جب کبھی، کوئی بھی، امریکہ مخالفت باتیں کرتا ہے تو اس وقت کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہاں کوئی امریکی آئین اور قانون کی رو سے تیسری بار صدر نہیں بن سکتا تو حضور والا! ہے کوئی پوچھنے کہ پاکستان میں اس آئین کو کیوں ختم کیا گیا؟ جس کے باعث کوئی پاکستانی تیسری بار وزیر اعظم نہیں بن سکتا۔ لیکن یہاں روگ یہ ہے کہ ہمیں وہ پاکستان عزیز نہیں جس کے باعث جماعتوں کا کوئی وجود ہے بلکہ ہمیں اپنی غلط یا صحیح سیاسی نظریاتی فکری وابستگیاں عزیز ہیں۔

آج پاکستان کے مجموعی ذرائع ابلاغ جمہوریت کے نام پر موروثیت کی مکروہ مذموم فریبانہ صورت کو روشناس کروانے اپنا بھرپور کردار ادا کررہے ہیں وگرنہ ہر سیاسی جماعت میں آج گئے گزرے دور میں بھی تعلیم یافتہ بااصول محب وطن موجود ہیں مگر وہ مرکزی قیادت میں اس لیے نہیں آسکتے کہ وہ کسی Supreme کے سدھی نہیں اور کسی سیاسی مقتدر کی نظروں میں کھپنے والے نہیں۔

محمد ضیاء الحق لکھنا چاہئے تھا

کسی صحافی کے اداریے اس کے نامۂ اعمال کا جزو لاینفک رہیں گے دنیا و آخرت میں جزا اور سزا کے مراحل گزریں گے اور اگر کوئی قاری تحریر بالخصوص اداریہ کو پڑھ کر کسی قابل غور یا قابل اعتراض نقطے یا نقاط پر اپنی مثبت یا منفی رائے کا اظہار نہیں کرے گا تو وہ یا تو مرد حق کہلائے گا یا گونگا شیطان۔ العیاز باللہ کہ کوئی گونگا شیطان کہلائے۔

ماہنامہ 'اطراف' کا اداریہ اس کے مدیر اعلیٰ طارق محمود شام ہی تحریر فرماتے ہیں اس وقت جولائی 2024 کا اطراف پیش نظر ہے۔ ابتدائی سطور میں صاحب اداریہ نے اس کے عنوان 'پاکستان کے تقریبی مقامات پر پاکستانیوں کے منتظر' سے متعلق بات جو انہوں نے مورخ صحافی کے طور پر لکھ دی کہ ''پاکستان کے سب سے سفاک فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق.....'' ایک عام آدمی تعریف اور تنقید کے بغیر نہیں رہ سکتا تو کسی مقتدر کو کیسے استثنا مل سکتا ہے؟ فکری پس منظر کے تحت صاحب اداریہ جولائی کے مہینے میں 1977 کی پانچ تاریخ کو مارشل لاء نافذ ہوا تھا اس کی تلخ یادوں نے یہ جملے لکھوائے ہیں۔ مارشل لاء جن عوامل کا ردِ عمل تھا ان کی ذمہ داری کسی پر عائد نہ کرنا صحافتی تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہے کوئی آدمی زندہ ہو یا متوفی اس کا ایک حق تو سلب نہیں کیا جاسکتا وہ اس کا مکمل نام ہے۔ لہٰذا صاحب اداریہ کو محمد ضیاء الحق لکھنا چاہئے تھا۔ جیسا کہ بھٹو صاحب کو ذوالفقار علی بھٹو ہی کہا اور لکھا جاتا ہے۔

سیر و سیاحت

سیر و سیاحت کے بارے میں آگاہی پیدا کرتے وقت ادائیگی نماز اور ذکر الٰہی کے ساتھ قرآنی فکر کہ .....قل سیروفی الارض..... کی طرف توجہ مبذول کروادی جائے تو دعوت الی الحق میں شمار ہوجائے گا۔ نمازِ قصر کے مسائل اور مسلمان سیاحوں کا بروقت نماز ادا کرنے کی جستجو میں رہنا عورتوں کے حقوق کا واویلا مچاتے رہنے والے یہ آگاہی بھی پیدا کریں کہ سیاحی مقامات پر اور ملحقہ راستوں علاقوں میں مساجد کے اندر خواتین کے لیے حلقۂ عبادت مختص کیا جائے اور اسی طرح حمامات بھی۔ موٹروے پر واقع حمامات میں سے خواتین کے لیے علیحدہ ہیں۔ دوران سفر نماز (کسی بھی) کا وقت ہوجائے تو سواقین Drivers روک دیتے ہیں۔ جزاک اللہ خیر۔

ماہنامہ 'اطراف'، چونکہ داعی اور مدعی ہے اپنے نظریہ کا Bridging the Extremes تو سیاحت کے دوران یادِ الٰہی کی طرف سیاحوں کو متوجہ کرنا بھی اس کی کوششوں میں شامل ہونا چاہئے۔

کراچی پورٹ ٹرسٹ اسٹاف کالج میں عالمی صورتحال پر سید مشاہد حسین کا خطاب

بہت مناسب ہوتا کہ آپ (ماہنامہ 'اطراف') سید مشاہد حسین صاحب کے خطاب کو شائع بھی کردیتے۔ سولہ تصاویر بھی بہت کچھ بیان کررہی ہیں تاہم خطاب شائع نہ کرکے قارئین کی تشنگی نہ صرف برقرار بلکہ بڑھادیا۔ آپ نے بہت خوب کہا کہ پاک چین دوستی کے معماروں میں سے ایک۔ ہر حکمران پاکستان چین کی طرف متوجہ رہا۔ فی الحقیقت مسلمانوں کے لیے چین سے ایک اہم تعلق رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وہ حدیثِ مبارکہ ہے کہ علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین جانا پڑے۔

کرن ساہنی، سینئر بھارتی صحافی

جناب عالی! موصوف کی یہ رائے کہ انڈیا، پاکستان کو قرضہ دے پر ہمارا جواب یہ ہے کہ بہت شکریہ۔ لیکن پہلے بھارت اپنے ملک سے غربت دور کرلے۔

ہمارے پاکستان کی معیشت مسائل کا شکار ہے، یہی کشمکش حیات ہے جس سے ہندوستان کو بھی استثناء نہیں۔

بہ فضل تعالیٰ پاکستان نے اپنے اولین ادوار میں غیر مسلم ممالک کو بھی قرضے دیے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا خود اس کی معیشت مسائل سے دوچار ہے۔

موصوف اپنی حکومت ہند کو یاد دلائیں کہ 1947 میں جب دو ممالک قائم ہوئے اُس وقت جو

Assets پاکستان کو ملنے تھے ان کو نیک نیتی اور خوش دلی سے دے دیا جائے۔ جناب کرن ساہنی مسئلہ کشمیر کا کوئی ذکر نہیں۔ ماہنامہ 'اطراف' کی ذمہ داری ہے کہ مذکور جواب جناب کرن ساہنی کی توجہ میں لایا جائے۔

پاکستان قونصل خانے پر حملہ

جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں 20 جولائی 2024 کو اخباری اطلاعات کے مطابق تقریباً چار سو افغان باشندوں نے پاکستانی قونصل خانے پر دھاوا بول دیا۔ جھنڈے تو اسی ملک کے تھے۔ جو ہمارا اسلامی ہمسایہ ہے لیکن افراد واقعی افغان تھے یا ان کو نام افغانوں کا دیا۔

ازحد افسوس ہوا کہ افغانستان پر 1979 میں روس کے حملے سے لے کر اب تک جو کچھ پاکستان نے کیا وہ کسی اور ملک کا تعاون نہ ہو سکا۔

وزارتِ خارجہ پاکستان نے جرمنی سے شدید احتجاج کیا ہے۔ صرف معذرت کر لینا کافی نہیں۔ اتنی تعداد میں افراد چشم زدن تو نہ جمع ہو گئے۔ حساس حفاظتی آلات کی موجودگی میں ایسا منظم حملہ کس طرح صرفِ نظر کا شکار ہو سکتا ہے؟ پاک افغان تعلقات میں قیام پاکستان سے لے کر، بالخصوص روسی حملے کے بعد کیا کیا نشیب و فراز آئے کا تجزیہ کرنے کے لیے ایک دفعہ پھر تاریخ کو پڑھنا ہو گا۔ پاکستانی صحافی کیا لکھتے رہے، سفارت کار (علاقائی و بین الاقوامی) کیا بتاتے رہے، دوبارہ جاننا ہو گا کہ مستقبل کا محفوظ دیرپا سیدھا راستہ اختیار کیا جا سکے۔

کسی بھی ہمسائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور پھر اسلامی ملک بھی ہو۔

کسی بھی ملک کے سیاسی و معاشی حالات کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ آئی ایم ایف کا بیل آؤٹ پیکیج اپنی منظوریوں کے آخری مراحل میں ہے اور ساتھ یہ واقعہ بھی پیش آ گیا ہے۔ پاکستان کو جب بھی کسی بھی صورت میں امداد ملنی ہو تو محسوس کیے جانے والے واقعات پیش آتے ہیں۔

ماہنامہ 'اطراف' جولائی 2024

''پاکستان خطّے میں بھرپور قائدانہ کردار ادا کرے۔'' مذکورہ عنوان پر راقم التحریر سے اتفاق بھی ہے اور اس کے ایک حصّے سے شدید اختلاف بھی۔

اوّلین حصّے میں جو کچھ انہوں نے لکھا وہ درست ہے کہ افغانستان اپنے ہمسائے ملک پاکستان کی قربانی ایثار کی اہمیت کو سمجھے۔ جس سے اختلاف ہے وہ یہ لکھنا کہ...... اس گھستے پٹے فلسفے کو ردّی کی ٹوکری میں پھینکنا ہو گا کہ افغانستان ایشیا کا دل ہے اور یہ کہ افغانستان میں امن ہو گا تو ایشیا میں امن ہو گا۔

جواب ملاحظہ ہو!

حدیثِ مبارک میں ارشاد ہوتا ہے کہ مومن کی فراست نظر سے ڈرو (اہمیت دو) کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ صاحب التحریر نے جس فلسفے کو گھسا پٹا کہا وہ اس لیے مسترد کیا جانا چاہئے کہ یہ حقیقت علامہ محمد اقبالؒ نے منکشف کی تھی اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا کہ وہ درست ہے۔

ماضی قریب کی تاریخ، روس نے حملہ کیا خود ٹوٹ گیا۔ دو دہائیوں سے زائد عرصہ افغانستان میدانِ حرب بنا رہا۔ اور کھربوں ڈالرز (ایک اطلاع یہ ہے کہ دو کھرب ڈالر کا نقصان خرچ)۔

اعداد و شمار لائق پڑتال بھی ہوتے ہیں اور بدلتے رہتے ہیں) امریکہ کا ہوا۔ روس قبضہ کرنے آیا تھا خود شکست و ریخت کا شکار ہوا۔ اور یوں روس مکافاتِ عمل کا شکار اس طرح ہوا کہ اس ملک نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں کردار ادا کیا۔ اور اب ہندوستان جب بھی ٹوٹے گا تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر جائے گا۔ خود ہیلری کلنٹن نے اپنے ملک امریکہ پر تنقید کی تھی کہ جب ہمارا مفاد تھا تو افغان مجاہدین تھے جب امریکہ کا مفاد نہیں رہا اور ویت نام خائب و خاسر ہوا تو اب یہی مجاہدین سر پسند اور فسادی ہو گئے۔

آنجہانی کسینگر سچ بول گئے کہ امریکہ کے مفادات ہیں، دوست نہیں۔

علامہ محمد اقبالؒ کے اشعار درج ذیل ہیں۔

آسیا یک پیکر آب و گل است
ملت افغان در آں پیکر دل است

ایشیا مٹی اور پانی کا ایک جسم ہے۔ جبکہ ملت افغان اس جسم میں ایک دل ہے (گویا) اگر دل یعنی افغان قوم اپنے آپ کو درست کر لے، سنوار لے، تو Asian Countries کی بھی حالت سنور جائے گی۔

از فسادِ او، فسادِ آسیا
در کشادِ او، کشادِ آسیا

اس قوم کے بگاڑ/فساد سے ایشیا کا بگاڑ ہے، جبکہ اس کی خوشحالی ایشیا کی خوشحالی کا باعث بنے گی۔

چند سوالات و مشاہدات تجاویز

1۔ وہ کیا وجوہ ہیں کہ روس، امریکہ، بھارت، چائنا افغانستان کے بارے میں حربی سفارتی محاذوں پر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں؟ ایک مسلم برادر ملک کے حوالے سے پاکستان اور افغانستان لاتعلق نہیں رہ سکتے۔

2۔ افغان کٹ گئے، لڑ گئے لیکن پسپائی اختیار نہیں کی۔

3۔ جب جب بھی افغانوں کو حکومت ملی ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں۔

4۔ کیا وجہ ہے کہ پاکستان جس نے افغانستان کے لیے سب سے زیادہ قربانی دی آج اس کے خلاف کیوں؟

5۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ افغانستان پر جب روس نے حملہ کیا اور یہ ملک خطّہ میدان کارزار بنا رہا اس دَور کے صحافیوں، فوجیوں اور سفیرانِ کرام کے تجزیے دوبارہ سے پڑھے جائیں اور ڈپلومیٹس کی آراء اور تجزیے سب سے اہم۔

6۔ پاکستان اپنی مقروض معیشت کی موجودگی میں کبھی اپنی مرضی کی خارجہ حکمتِ عملی اپنا سکے گا؟

بانیانِ پاکستان اور ان کے رفقائے کار کے افکار و نظریات نظر انداز کر کے The Greater Pakistan Movement یا کوئی اور تنظیم کامیابی تو کیا جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی پھرے گی۔

اگرچہ نام لیے بغیر لیکن یہ جانتے ہوئے کہ افغانستان کے بارے میں افکار بصورت اشعار علامہ اقبالؒ کے ہیں، کے بارے میں انتہائی قابلِ مذمت آراء کو ماہنامہ 'اطراف' میں شائع کر دیا گیا۔ قابلِ افسوس ہے۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

(علامہ اقبالؒ)

افغانستان کے بارے میں حضرت علامہ کے اشعار جاوید نامہ اس روحانی سفر، ہفت افلاک کی سیر، جو آپ نے پیر رومیؒ کی معیت و رہنمائی میں کیا، لکھے گئے۔ اس سفر کی روئیداد کے مطابق خیالات احمد شاہ ابدالی کے ہیں، جو انہوں نے زندہ رود (حضرت علامہؒ) کے ساتھ اور شاعری حکیم الامت کی ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ کے افکار کے بارے میں بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کے تاثرات جو اقبال اکادمی پاکستان' لاہور نے شائع کیے ایک بار پھر توجہ قارئین ماہنامہ 'اطراف' کے لیے حاضر ہیں۔

''شعراء اقوام میں جان پیدا کرتے ہیں، ملٹن، شیکسپیئر، بائرن وغیرہ نے قوم کی بے بہا خدمت کی ہے۔ کارلائل نے شیکسپیئر کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز کا ذکر کیا ہے۔ اسے جب شیکسپیئر اور دولت برطانیہ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو اس نے کہا' میں شیکسپیئر کو کسی قیمت پر نہ دوں گا!' گو میرے پاس سلطنت نہیں ہے، لیکن اگر سلطنت مل جائے اور اقبالؒ اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو میں اقبالؒ کو منتخب کروں گا۔'' (قائداعظم محمد علی جناحؒ)

(طارق محمود۔ ساہیوال)

(ماہنامہ 'اطراف' کی خوش قسمتی ہے کہ طارق محمود صاحب جیسے دردمند۔ قائداعظم اور علامہ اقبال کے دلدادہ 'اطراف' کے مندرجات کا انتہائی غور سے مطالعہ کرتے ہیں۔ پھر اپنے دلی جذبات اور خیالات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔)

جب امریکہ عالمی طاقت نہیں رہے گا

”اطراف‘ گزشتہ دس سال میں مغربی دنیا کی بہت سی کتابوں کو اُردو میں منتقل کرچکا ہے۔ اب فرید ذکریا کی کتاب ’جب امریکہ عالمی طاقت نہیں رہے گا‘۔ کو سید عرفان علی یوسف اُردو میں آپ کے لیے منتقل کررہے ہیں۔ کہ اب چین سمیت بہت سے ممالک عالمی طاقت بن کر ابھر رہے ہیں۔ امریکہ پہلے کی طرح ناگزیر نہیں رہے گا۔ بہت اہم نکات ہیں۔ مستقبل آپ کے سامنے ہے۔ نوجوانوں کو خاص طور پر یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔“

امریکہ قرضدار قوم۔ چین حکومت تاجر بہت محتاط

مصنف: فرید ذکریا تلخیص وترجمہ: سید عرفان علی یوسف

قسط نمبر 1

دیباچہ:

دنیا کی تیز ترین ریس کار:

جب بھی کوئی سنہری دور قریب آتا ہے تو یہ دور جتنا چمکدار ہوتا ہے، اس کا انجام اتنا ہی خوف ناک ہوتا ہے۔ 2008 کی مالیاتی تنزلی 1929 کے بعد دنیا کا بدترین مالیاتی بحران تھی۔ اس بحران کے نتیجے میں عظیم کساد بازاری کے بعد بدترین معاشی سست روی کا آغاز ہوا۔ عالمی معیشت میں تقریباً 50 ٹریلین ڈالر کے اثاثوں کی تباہی ہوئی۔ سرمایہ کاری نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ دنیا بھر میں بیل آؤٹ اور محرک پیکجز میں کھربوں ڈالر کا اضافہ ہوا۔ اب ہم ایسے دور میں جی رہے ہیں جس کا شمار تباہ حال نسلوں میں کیا جائے گا اور ان پر مطالعات جاری رہیں گے۔ ہم یہاں تک کیسے پہنچے؟ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس تباہی کی بنیادی وجہ کچھ کامیابیاں بنیں۔ پچھلی چوتھائی صدی غیر معمولی ترقی کی صدی تھی۔ عالمی معیشت کا حجم ہر دس سال یا اس کے بعد دوگنا ہوتا گیا اور 1999 میں 31 ٹریلین ڈالر سے 2008 میں 62 ٹریلین ڈالر تک پہنچ گیا۔ افراط زر حیرت انگیز طور پر مسلسل کم رہا۔ اقتصادی ترقی نئے خطوں تک پہنچ گئی۔ مغربی خاندان پہلے سے بڑے گھروں میں چلے گئے۔ انہوں نے نئے لیپ ٹاپ اور سیل فون خریدے، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے کسانوں نے تیزی سے بڑھتے ہوئے شہروں میں نئی ملازمتیں تلاش کیں۔ افریقہ میں بھی، لوگ اپنا مال عالمی منڈی میں بیچنے کے قابل ہوگئے۔ ہر جگہ مال کی قیمتیں گر گئیں جبکہ اسٹاکس، بانڈز، اور رئیل اسٹیٹ کی شکل میں دولت بڑھ گئی۔ میکرو اکنامک اشارے کہانی کے دوسرے پہلو کو ظاہر کرتے ہیں۔ 2006 اور 2007 میں دنیا کے 124 ممالک کا تقریباً دو تہائی 4 فیصد سالانہ سے زیادہ تیزی سے بڑھا۔ عالمی ترقی کی وجہ کیا تھی؟ میں نے اس کتاب میں یہ سب تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ ترقی سیاسی، اقتصادی اور تکنیکی قوتوں کا مجموعہ تھی۔

سیاست:۔

سوویت یونین کے خاتمے نے سیاسی استحکام کے نئے دور کا آغاز کیا۔ سرد جنگ کے دوران، درجنوں خانہ جنگیاں، مسلح شورشیں، اور چھوٹے گوریلا گروپس سرگرم عمل تھے جن کو سوویت یونین نے فنڈز فراہم کیے تھے۔ اور ان سے مقابلے کے لیے مغرب نے اپنے اتحادیوں کو مالی امداد فراہم کی۔ خانہ جنگیاں پھوٹ پڑیں۔ 1990 کی دہائی میں کانگو میں وحشیانہ خونریزی ہوئی۔ یقیناً القاعدہ کی دہشت گردی اس کے علاوہ تھی، لیکن

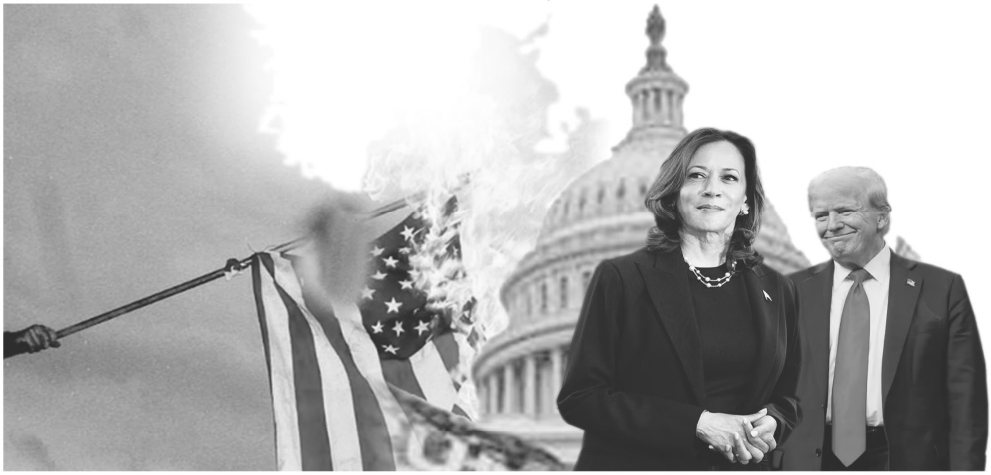

پوری دنیا نے گزشتہ صدیوں سے کہیں زیادہ امن اور استحکام کا لطف اٹھایا۔ سیاسی تشدد کی وجہ سے ہونے والی اموات کی تعداد میں مسلسل کمی ہوتی رہی۔

معاشیات:۔

کمیونزم کے خاتمے نے آزاد منڈی کی سرمایہ داری کو فروغ دیا اور آزاد معیشت چلانے کے واحد قابل عمل طریقہ کو فروغ ہوا، جو ہر جگہ حکومتوں کے بین الاقوامی اقتصادی نظام کا حصہ بننے کی زبردست ترغیب کا سبب بنا۔ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن جیسے نئے معاہدوں اور اداروں نے تجارتی رکاوٹوں کو کم کرنے اور دنیا کو مربوط کرنے کے لیے کام کیا۔

جب تباہ حالی کی بنیاد کامیابیاں بنتی ہیں

حکومتیں:۔

ویتنام سے کولمبیا تک مختلف ملکوں نے محسوس کیا کہ وہ خوشحالی کی عالمی دوڑ سے محروم ہونے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے قرض کی سطح کو کم کرنے اور سبسڈیز کو ختم کرنے کی اچھی پالیسیاں اپنائیں۔ اس لیے نہیں کہ باب روبن یا ہانک پالسن جیسے لوگوں نے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کیا، بلکہ اس لیے کہ وہ اس سمت میں آگے بڑھنے کے فوائد دیکھ سکتے تھے (اور ایسا نہ کرنے کے اخراجات میں اضافہ دکھائی دے رہا تھا)۔ ان اصلاحات سے غیر ملکی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی ہوئی اور نئی ملازمتیں پیدا ہوئیں۔

ایک ہی وقت میں مختلف مرکزی بنکار کاروباری سائیکل کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اعتدال پسندی سب سے بہتر طریقہ تھا۔ اتار چڑھاؤ سے ملازمتیں اور بچتیں تباہ ہو سکتی تھیں اور بدامنی اور انقلاب کا باعث بن سکتی تھیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں 1854 اور 1919 کے درمیان، کساد بازاری ہر چار سال کے وقفے سے آتی رہی اور جب بھی آئی تو تقریباً دو سال تک جاری رہی۔ پچھلی دو دہائیوں کے دوران، ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے کساد بازاری کے درمیان آٹھ سال کی مسلسل ترقی کا تجربہ کیا، اور مندی آئی تو صرف آٹھ ماہ تک جاری رہی۔ پھر استحکام کا دور آیا۔ 1980 کی دہائی کے اوائل میں پال وولکر کے ساتھ مرکزی بنکاروں نے اشیا کی قیمتوں کو مستحکم رکھنے کے لیے مالیاتی پالیسی کے آلات استعمال کیے اور افراط زر کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اس جنگ میں جو حکمت عملی اختیار کی گئی وہ امریکہ کی کامیاب ترین برآمدی پالیسیوں میں سے ایک بن گئی۔ 2007 تک، صرف تیئس ممالک میں افراط زر کی شرح 10 فیصد سے زیادہ تھی، اور صرف زمبابوے کو افراط زر کا سامنا تھا۔

ٹیکنالوجی .:

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلاب نے عالمی معیشت کے عروج کو تیز کیا۔ مواصلاتی اخراجات کم ہو گئے، معلومات تک ہر جگہ رسائی ہو گئی، اور انضمام آسان ہو گیا۔ نیبراسکا کے کھیلوں کا سامان چین سے حاصل کر کے، یورپ کو فروخت کیا جا سکتا تھا، اور بنگلور کے اکاؤنٹنٹس کے ذریعے اس کی چیک بک کو متوازن کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس تمام کامیابی کا سب سے بڑا ضمنی اثر کم افراط زر، عالمی ترقی، تیز تکنیکی ترقی، یا زیادہ تکنیکی ترقی پر پڑا اور عالمی معیشت کو لاحق خطرات کم ہوئے۔ 90 کی دہائی کے دوران، تاجروں نے سیاسی خطرات یعنی بغاوتوں، دہشت گردوں کے حملوں اور سماجی انتشار سے بچتے ہوئے اقتصادی ترقی کو لاحق خطرات پر نظر رکھی۔ سیاسی خطرات کم ہو گئے۔ بغاوتوں کے نتیجے میں جو نئی حکومتیں آئیں ان سے عالمی معیشت کی ترقی میں رکاوٹیں پڑیں لیکن مواقع میں اضافہ بھی ہوا۔ دہشت گردی اور آفات کے باوجود سرد جنگ کے بعد کی دنیا کا بنیادی سیاسی استحکام برقرار رہا۔ ان تاجروں نے گھر کے قریب ایک بہت زیادہ واقف مسئلے پر بہت کم توجہ دی۔

اوسط گھرانوں کے پاس 13 کریڈٹ کارڈ اور سب مقروض

معاشی خطرہ:۔

ایلن گرینس پین کی طرح، انہوں نے فرض کر لیا کہ پیچیدہ مالیاتی مصنوعات کی نشوونما چاروں طرف پھیل کر اقتصادی خطرات کو کم کر رہی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ قرض کی وہ سطحیں جو کبھی خطرناک سمجھی جاتی تھیں اب قابل انتظام ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ حالات کو مستقل طور پر تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں سرمایہ کاروں نے اس نئی ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری کر کے مصنوعات کا ڈھیر لگا دیا جسے عام طور پر خطرناک سرمایہ کاری سمجھا جاتا تھا۔ یہ سب کچھ نسبتاً کم انعام کے وعدے پر ہوا۔ کریڈٹ اسپریڈز اور یو ایس ٹریژری بانڈ کے درمیان پیداوار میں فرق، جسے دنیا کی سب سے محفوظ سرمایہ کاری سمجھا جاتا تھا اور محدود ٹریک ریکارڈ والی کمپنیوں کے بانڈز تاریخی گراوٹ کا شکار ہو گئے۔ ایکواڈور جیسے غیر مستحکم ممالک اور کرسلر جیسی کمپنیاں بھی تقریباً اتنے سستے قرضے لے سکتی تھیں جتنی کہ امریکی حکومت خود لے سکتی تھی۔ (2009 تک، ایکواڈور نے اپنے قرضے میں ڈیفالٹ کیا اور دیوالیہ ہونے سے آخری لمحے کی حکومتی بیل آؤٹ کی وجہ سے بچ سکا۔) چونکہ قرض سستا تھا، اس لیے فنانسرز اور گھروں کے مالکان اپنے وسائل سے زیادہ خرچ کرتے ہوئے اسے ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے تھے۔ بنکوں اور سرمایہ کاروں کو جنہوں نے سستی نقدی فراہم کی تھی، کارپوریٹ خزانوں کے ذریعے یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ منافع جو 2002 اور 2006 کے درمیان لگاتار اٹھارہ سہ ماہیوں میں دوہرے ہندسوں میں بڑھا جبکہ دیوالیہ پن کی شرحیں معمول سے کافی کم تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ اچھا وقت کبھی ختم نہیں ہوگا۔ عالمی معیشت ایک ریس کار کے طور پر متعارف ہو چکی تھی، حالانکہ یہ ناقابل یقین حد تک مہنگی تھی، لیکن یہ شاندار رفتار سے کارکردگی دکھانے کے قابل تھی۔ پچھلی دہائی سے ہر ایک نے اس پر سواری کی اور ایڈرینالین رش اور اونچائی کا تجربہ کیا۔ صرف ایک مسئلہ تھا: یہ پتہ چلا کہ یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس طرح کی کار کی ڈرائیونگ کیسے کی جائے گی؟ پچھلے دس سالوں میں، عالمی معیشت ایک ایسی چیز بن گئی جس میں تقریباً 125 ممالک کا مربوط نظام اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس نظام میں سبھی حصہ لے رہے تھے اور سب کچھ اس رفتار سے چل رہے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے ریس کار 125 کو مختلف ڈرائیور چلا رہے تھے اور کسی کو شاک ابزوربر خریدنا یاد نہیں تھا۔

مواصلاتی اخراجات کم۔ معلومات تک رسائی تیز

قرض کا مسئلہ:

اصل مسئلہ وہ لوگ تھے جو جھٹکا جذب کرنے والا نظام چاہتے تھے لیکن انہیں عروج کے سالوں کے دوران ناکارہ تصور کر لیا گیا۔ سوال یہ تھا کہ سب پرائم مارگیجز کے پیکجز کو جنرل الیکٹرک کے بانڈز کی طرح اعلیٰ درجہ کیوں دیا جائے؟ یکے بعد دیگرے ہر سال کا اختتام ایک چشم کشا آمدنی کی رپورٹ یا ہیج فنڈ منیجر کی اربوں ڈالر کی تنخواہ کے ساتھ ہوا۔ بہت زیادہ وعدے کیے گیے لیکن تصحیح عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہی، اور ناقدین خاموش اور پرسکون ہوتے گئے۔ وال اسٹریٹ پر ایک قسم کی معکوس ترقی دکھائی دی جو فطری انتخاب تھی۔ ایگل کیپیٹل کے منیجنگ ڈائریکٹر، بوئکن کری نے کہا: پچھلے بیس سالوں میں "تقریباً ہر مالیاتی ادارے کا ڈی این اے خطرناک طور پر تبدیل ہو چکا ہے۔ ہر بار جب میز پر موجود کسی نے زیادہ فائدہ اٹھانے اور زیادہ خطرے کے لیے دباؤ ڈالا، اگلے چند سالوں نے ثابت کر دیا کہ 'سب ٹھیک تھا۔ اقتصادیات کے نئے ماحول میں لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی، انہیں ترقی دی گئی، اور انہوں نے سرمایہ پر مزید کنٹرول حاصل کر لیا۔ دریں اثنا، اقتدار میں کوئی بھی شخص جو ہچکچایا، اس نے احتیاط کی، وہی 'غلط' ثابت ہوا۔ محتاط قسموں کو تیزی سے ڈرایا گیا، لیکن پروموشن کے لیے پاس کر دیا گیا۔ انہی لوگوں نے سرمائے پر اپنی گرفت کھو دی۔ وارن بیفٹ نے وضاحت کی کہ اس مسئلے کا وال اسٹریٹ کے فینسی لفظ 'مرکزی بیعانہ' کی بڑھتی ہوئی سطح سے تعلق تھا۔ قرض کے لیے وال اسٹریٹ کا فینسی لفظ غلط نکلا۔ بوفے نے کہا کہ "یہ واحد راستہ ہے جس سے ایک ہوشیار آدمی بھی ٹوٹ سکتا ہے۔' آپ اسمارٹ کام کرتے ہیں تو آپ آخر کار بہت امیر ہو جاتے ہیں۔ سمارٹ کارکردگی والے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر آپ غلط کام کرتے ہیں تو یہ خراب کارکردگی آپ کو ختم کر سکتی ہے، کیونکہ کسی بھی چیز کے واقع

ہونے کا وقت صفر ہوتا ہے۔

جب آس پاس کے لوگ کامیابی حاصل کر رہے ہوں، تو آپ کامیابی کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ اور یہ بہت کچھ ایسا ہے جیسے میدان میں گیند پر لڑکے ہر وقت بہتر نظر آتے ہیں، موسیقی بہتر لگنے لگتی ہے، اس وقت زیادہ مزہ آتا ہے جب آپ سوچتے ہیں کہ!کیوں؟ میں 12 کے ایک چوتھائی پر چھوڑ دوں؟ میں تو 12 سے دو منٹ پہلے چھوڑوں گا؟ لیکن مشکل یہ ہے کہ دیوار پر کوئی گھڑیاں نہیں ہیں اور ہر کوئی سوچتا ہے کہ وہ 12 سے دو منٹ پہلے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اسی طرح کی کہانی تھی کہ جب ہم 2008 کی آفت تک پہنچے۔ کسی نہ کسی سطح پر، لیا ہوا

چین کے پاس 2 ٹریلین ڈالر سے زیادہ غیر ملکی زرمبادلہ

قرض پوری کہانی کے قلب میں ہوتا ہے۔ 1980 کی دہائی کے اوائل سے، امریکیوں نے قرض کا اپنی پیداوار سے زیادہ استعمال کیا اور قرض لے کر فرق پورا کیا۔ معاشرے کی ہر سطح پر ایسا ہوا۔ گھریلو قرضہ 1974 میں 680 ارب ڈالر سے بڑھ کر 2008 میں 14 ٹریلین ڈالر تک پہنچ گیا۔ صرف پچھلے سات سالوں میں یہ دگنا ہو گیا۔ اوسط گھرانے کے پاس اب تیرہ کریڈٹ کارڈز ہیں اور ایک رہن پر $120,000 کا مقروض ہے۔

کچھ معیارات کے مطابق، گھرانوں نے کفایت شعاری کی انتہا کی۔ ریاستی اور مقامی سطح پر سیاست دانوں نے، جو ٹیکس میں اضافہ کیے بغیر اپنے حلقوں کو نئے باسکٹ بال اسٹیڈیم اور بارہ لین والی شاہراہیں دینے کے

خواہشمند تھے، مستقبل کیا مکانات کے خلاف قرضے لینے لگے۔ انہوں نے پالتو جانوروں کے منصوبوں کی ادائیگی کے لیے بانڈز جاری کیے، ایسے بانڈز جن کی پشت پناہی مستقبل کے ٹیکسوں یا لاٹری کی کمائی سے کی گئی تھی۔ لیکن ان سیاستدانوں کو بھی قرض لینے والوں کے حقیقی بادشاہ یعنی وفاقی حکومت نے شرمندہ کیا:۔ 1990 میں قومی قرضہ 3 ٹریلین ڈالر تھا۔ 2008 کے آخر تک، یہ گیارہ ہندسوں کے دائرے میں اوپر چڑھ گیا اور $10 ٹریلین کو عبور کیا۔ (اس تحریر کے وقت، یہ پہلے ہی $11 ٹریلین پر تھا۔) نیویارک شہر میں مشہور نیشنل

امریکہ کو صحت کی دیکھ بھال کے لیے رقم چین سے لینا ہوگی

ڈیبٹ کلاک میں تمام اعداد و شمار ظاہر کرنے کے لیے جگہ ختم ہو گئی۔ اس کے مالکان اس سال ایک نئی اور توسیع شدہ گھڑی نصب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

امریکہ دوسرے لفظوں میں قرض داروں کی قوم بن گیا۔ قرض پر قرض اور بیعانہ میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ اس کا استعمال احتیاط سے کیا جائے۔ یہ قرض جدید معیشت کے دل کی دھڑکن ہیں۔ لیکن حد کو عبور کرنا معیشت کا قتل ہے۔ قرض مساوات کے دونوں اطراف متوازن ہونا چاہیے۔ اگر ریاستیں قرض دینے کے لیے تیار نہ ہوتیں تو امریکہ کبھی بھی ایسی پوزیشن پر نہیں پہنچ سکتا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ترقی پذیر دنیا کی معاشی اور سیاسی بااختیاریت "باقی کے عروج" کی علامت تھی۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ یہ چین کے عروج کی علامت ہے۔

مسلسل ترقی کے باوجود، چینی گھرانوں اور کارپوریشنوں نے محتاط رہنے کا رجحان رکھا۔ وہ اپنی تقریباً نصف کمائی بنک قرض پر لگاتے ہیں۔ پھر ہمیشہ آخری یعنی واپسی کے دن کی تیاری کرتے ہیں۔ اعلیٰ نمو کے ساتھ مل کر اس طرح کی انتہائی کفایت شعاری چین کے سرمائے کے وسیع نئے تالابوں کی تشکیل کا باعث بنی لیکن یہ محض کنفیوشس کی ثقافتی خصوصیت نہیں تھی۔ چینی حکومت نے اخراجات کی حوصلہ شکنی اور بچت کی حوصلہ افزائی کی۔ یہ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے تھا کہ افراط زر کم رہے اور کی کرنسی کی قدر بھی کم رہے جس نے چینی اشیاء کو سستا اور صارفین کے لیے پر کشش بنا دیا۔

1997، میں جب ایشیا کی معیشتیں زوال کا شکار ہوئیں اور مغربی بنکار بچاؤ کے لیے آئے لیکن اس کے لیے سخت شرائط پیش کیں۔ زوال سے صحت یاب ہونے کے بعد، ایشیائی حکومتوں اور ایشیائی ماہرین نے اپنے ذخائر جمع کرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ اگلی بار انہیں اجنبیوں اور غیر ملکوں کی مہربانیوں پر انحصار نہ کرنا پڑے۔ لہٰذا، اپنی بڑھتی ہوئی بچت کو اپنی ملکی معیشت میں دوبارہ لگانے کے بجائے، چینی حکام نے اسے چھپا دیا۔ یہ وقت تھا جب اسے دنیا میں سب سے محفوظ سرمایہ کاری سمجھا جاتا تھا: یو ایس ٹریژری بلز بڑے پیمانے پر امریکی قرضوں کے ذریعے پہنچتے تھے لیکن چینیوں نے اس کو سبسڈی دینا بند کر دی۔ انہوں نے ہمارے اخراجات کے لیے مالی اعانت فراہم کی اور ڈالروں کا وسیع ذخیرہ کر لیا۔ اس طرح چینیوں نے بچت کی جبکہ امریکیوں نے زیادہ استعمال کیا۔ لیکن پھر بھی نظام توازن میں تھا۔

یہ صرف چین ہی نہیں تھا۔ آٹھ دیگر ابھرتی ہوئی مارکیٹوں سے وابستہ ممالک نے 100 ارب ڈالر یا اس سے زیادہ کے جنگی خزانے جمع کیے جو زیادہ تر ڈالر میں تھے۔ اکیلا چین ہی 2 ٹریلین ڈالر سے زیادہ کے غیر ملکی کرنسی کے ذخائر پر بیٹھا ہے جو زیادہ تر ڈالر میں ہے۔ گزشتہ ستمبر میں، چین جاپان کو پیچھے چھوڑتے ہوئے امریکہ کا سب سے بڑا غیر ملکی قرض دہندہ بن گیا، جواب بڑی مقدار میں امریکی خزانے نہیں خریدتا۔ (اس وقت بقایا

پہلے امریکہ روس ایک دوسرے کی ضرورت۔ اب امریکہ چین

تمام ٹی بلوں میں سے 10 فیصد کے ساتھ، چین ممکنہ طور پر امریکہ کا سب سے بڑا قرض دہندہ ہے لیکن امریکی ٹریژری گھریلو قرض دہندگان کا سراغ نہیں لگاتی۔) چین اب دنیا کی سب سے بڑی IOU پرچی رکھتا ہے، اور اس پر انکل سام کے دستخط ہوتے ہیں۔

عالمی سطح پر زیادہ بچت کرنا اتنا ہی بڑا مسئلہ ثابت ہوا ہے جتنا زیادہ استعمال کرنا۔ ہارورڈ کے ماہر اقتصادیات ڈینی روڈرک نے اندازہ لگایا ہے کہ اتنی زیادہ رقم بیرون ملک بھیجنے کی بجائے اس پر سرمایہ کاری کرنے سے چینیوں کو تقریباً مساوی لاگت آتی ہے۔ یہ جی ڈی پی کا ایک فیصد سالانہ، یا سالانہ $40 بلین سے زیادہ ہے۔ چین کا قرضہ بنیادی طور پر ریاستہائے متحدہ کے لیے ایک بڑا محرک پروگرام تھا۔ اس نے شرح سود کو کم رکھا، جس نے گھر کے مالکان کو ری فنانس کرنے، ہیج فنڈ منیجرز کو فائدہ اٹھانے کا موقع دینے اور سرمایہ کاری کے بنکوں کو اپنی بیلنس شیٹوں کو آگے بڑھانے کی ترغیب دی۔ فنانشل ٹائمز کے کالم نگار مارٹن وولف کا کہنا ہے کہ چین کے قرضے نے سستا پیسہ پیدا کیا، اور "سستے پیسے نے مالی اختراع، قرض لینے اور خرچ کرنے کے 'ننگے ناچ' کی حوصلہ افزائی کی۔"

ولف نے لکھا کہ "معمول کے مطابق کاروبار میں واپسی نہیں ہو سکتی۔" لیکن مختصر مدت میں، ایسا لگتا ہے کہ ہم مزید جمود کا شکار ہیں۔ امریکی صدر نے عہدہ سنبھالنے سے کچھ ہی دیر پہلے، "آنے والے سالوں میں ٹریلین ڈالر کے خسارے" کے امکان سے خبردار کیا کیونکہ ان کی انتظامیہ گرتی ہوئی معیشت کو بحال کرنے کے لیے گرین ٹیکنالوجی سے لے کر صحت کی دیکھ بھال تک ہر چیز پر اخراجات کو بڑھا رہی تھی۔ اس رقم کا زیادہ تر حصہ چین سے لینا پڑے گا۔ چینیوں کے اپنے معاشی مسائل ہیں جن کو حل کرنا ہے اور وہ ان سے نمٹنے کے لیے اپنی جی ڈی پی کا 15 فیصد (600 بلین ڈالر) خرچ کر رہے ہیں۔ ہم چین سے کہہ رہے ہیں کہ وہ انسانی تاریخ کے دو سب سے بڑے مالیاتی منصوبوں میں توسیع کے لیے مالی اعانت کرے: ان میں ایک ہمارا اور ایک اس کا اپنا ہے۔ ملک کے پاس اپنے ٹی بل کی خریداری کی مہم کو جاری رکھنے کے لیے تمام تر ترغیبات ہیں۔ اس کے بغیر، چین کی برآمدات کو نقصان پہنچے گا، اور اس کی بلند شرح نمو زمین پر گر جائے گی۔ لیکن چینیوں کے پاس تمام آپشنز موجود ہیں۔ نوبل انعام یافتہ ماہر معاشیات جوزف اسٹگلٹز بتاتے ہیں کہ "چینی یقینی طور پر امریکی کھپت

کو جاری رکھنے کی کوشش کریں گے، لیکن اگر یہ واضح ہوجائے کہ یہ فارمولا کام نہیں کر رہا تو ان کے پاس پلان بی ہے۔ "پلان بی حکومتی اخراجات کے ذریعے چین کی اپنی کھپت کو بڑھانے اور اپنے لوگوں کو قرضے دینے پر توجہ مرکوز کرے گا۔ جیسا کہ مؤرخ نیل فرگوسن لکھتے ہیں، "آج سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا Chimerica (چین پلس امریکہ) کو ہمیشہ قائم رہنا ہے؟ وہ اس بحران کی وجہ سے ایک ساتھ رہتے ہیں یا الگ ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ ایک ساتھ رہتے ہیں، تو آپ جنگل سے باہر کا راستہ دیکھ سکتے ہیں۔ اگر یہ الگ ہوجاتے ہیں تو، عالمگیریت کو الوداع کہہ دیں۔"

بہترین منظر نامہ یہ ہوگا کہ چین اور ریاستہائے متحدہ اپنے 'باہمی خودکش معاہدے' کو آہستہ آہستہ ختم کرنے کے لیے مل کر کام کریں۔ چین کو اپنی ملکی معیشت میں دوبارہ سرمایہ کاری کرنے کے لیے زیادہ رقم ملنے سے فائدہ ہوگا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو کچھ سخت فیصلے کرنے سے فائدہ ہوگا جو بالآخر اس کی معیشت بہتر بنائے گا۔ کم از کم 1980 کی دہائی سے، امریکہ نے تسلیم کیا کہ وہ واپسی کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے تاخیر کرتے ہوئے خرچ کر سکتا ہے۔ لیکن یہ اس کی خارجہ یا ملکی پالیسی کے لیے اچھا نہیں رہا۔ اس نے واشنگٹن کو مغرور، سست اور لاپرواہ بنا دیا۔ کیونکہ مفت سواری کی سہولت جلد ختم ہونے والی ہے۔

امریکہ کے بعد کی دنیا کی طرف دھکیلنا:

اگرچہ اس مالیاتی بحران کا خدشہ کہیں زیادہ ہے، لیکن یہ بے مثال نہیں۔ سرمایہ داری کی تاریخ بلبلوں، گھبراہٹ، مالیاتی پستی اور کساد بازاری سے بھری پڑی ہے۔ ڈچ 1600 کی دہائی میں ٹیولپس پر اپنا دماغ کھو بیٹھے تھے۔ ریلوے انجماد نے 1840 کی دہائی میں انگریزوں کو مارا۔ یہاں تک کہ پچھلی چند دہائیوں میں، میکسیکو، ارجنٹائن، برازیل، اور تقریباً ہر دوسرے لاطینی امریکی ممالک میں مالیاتی آفتیں آئیں۔ روس اور اس کے سابقہ اتحادی 1990 کی دہائی میں دیوالیہ ہوگئے تھے، اور اس دہائی کے آخر میں وباء نے ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ 1998 میں لانگ ٹرم کیپٹل مینجمنٹ کا خاتمہ ہوا جو دنیا کے سب سے بڑے ہیج فنڈز میں سے ایک تھا اور یہ اتنا تشویشناک تھا کہ فیڈرل ریزرو نے مالیاتی نظام کو تباہ ہونے سے بچانے کے لیے ایک بیل آؤٹ کا اہتمام کیا۔ 2008 کا بحران اس سے بالکل مختلف تھا۔ یہ بحران ترقی پذیر دنیا کے بیک واٹر میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ عالمی سرمایہ داری یعنی ریاستہائے متحدہ کے قلب سے ابھرا اور بین الاقوامی مالیات کی شریانوں سے گزرا۔ یہ کچھ پنڈتوں کی رائے کے باوجود سرمایہ داری کے خاتمے کا اشارہ نہیں دیتا لیکن اس کا مطلب ریاستہائے متحدہ کے لیے عالمی تسلط کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔

چند مثالوں پر غور کریں۔ پچھلی دہائی کے دوران، امریکہ نے اپنے اثر و رسوخ کو وسعت دی جو صدیوں سے روس کے اثر و رسوخ میں مداخلت تھا۔ امریکی تسلط کو سرد جنگ کے بعد کے دور میں، ماسکو نے تسلیم کیا۔ اسے مدد کے لیے واشنگٹن کی ضرورت تھی۔ لیکن 2008 تک روس ایک زندہ طاقت تھا۔ فروری 2009 کے وسط میں کرغیز جمہوریہ نے مناس ایئربیس کو بند کرنے کے اپنے فیصلے کو حتمی شکل دی، جو ایک امریکی اڈہ تھا جو افغانستان میں آپریشنز کے لیے ضروری فضائی مدد فراہم کرتا تھا۔ خاص طور پر 2005 میں ازبکستان میں ایک اور فضائی اڈے کی بندش کے بعد اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اس کا محرک پیسہ تھا۔ امریکہ لیز پر سالانہ 55 ملین ڈالر ادا کر رہا تھا۔ اب اس نے سالانہ 100 ملین ڈالر ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ روسی حکومت نے اپنے گھر کے پچھواڑے میں امریکی فوج کی نیم دائمی موجودگی کے خیال کی شدید مخالفت کرتے ہوئے 2.3 بلین ڈالر کے امدادی پیکیج کی پیشکش کی جس نے امریکی مالی امداد کو کم کر دیا اور اس میں 180 ملین ڈالر قرض کی منسوخی، 150 ملین ڈالر کی امداد اور 2 بلین ڈالر کا قرض شامل تھا۔ فیصلہ ہوا کہ ہائیڈروالیکٹرک پاور سٹیشن کی تعمیر مکمل کی جائے جبکہ پاور پلانٹ ایک مشترکہ منصوبہ ہوا اور یہ کرغیز جمہوریہ کی بجلی کی پیداوار میں 40 فیصد اضافہ کرے اور ممکنہ طور پر ملک کی بجلی کی برآمد کو اس کی مکمل صلاحیت پر لے آئے۔ تیل کی قیمتیں 40 ڈالر فی بیرل تک گرنے کے باوجود، روس اب بھی زیادہ آزاد خارجہ پالیسی اپنانے کی پوزیشن میں تھا۔

بھارت جیسا نیا امریکی اتحادی بھی امریکہ سے اپنی آزادی برقرار رکھتا ہے۔ نئی دہلی بھارت کو ایک عام جوہری طاقت کے طور پر قانونی حیثیت دینے میں واشنگٹن کی حمایت کے لیے شکر گزار ہے، لیکن اس نے پھر بھی بنیادی سلامتی کے مسائل کو پیچھے دھکیل دیا۔ بہت زیادہ امریکی دباؤ کے باوجود، بھارت صرف ایران کو امریکہ کے خطرے کے طور پر نہیں دیکھتا۔ بھارت نے بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی میں امریکہ کے ساتھ ایک بار ووٹ دینے پر رضامندی ظاہر کی لیکن ایران کے ساتھ وسیع رابطے جاری رکھے، ان میں ایران کے ساتھ مشترکہ بحری مشقوں کا انعقاد شامل تھا۔ بھارت ایران کو تجارتی شراکت دار کے طور پر دیکھتا ہے اور اسے کسی بھی طرح تنہا کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اپریل 2008 میں، ایرانی صدر محمود احمدی نژاد کے پائلٹوں نے نئی دہلی میں ایندھن بھرنے کے لیے ٹھہرنے کی درخواست کی کیونکہ ایرانی رہنما سری لنکا کے دورے سے وطن واپس آ رہے تھے۔ بھارتی حکومت نے فوری طور پر باضابطہ دعوت نامہ جاری کیا اور چھ گھنٹے کے اسٹاپ کو سرکاری دورے میں بدل دیا۔

آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی موجودہ حالت بھی ایک مفید سبق فراہم کرتی ہے۔ امریکی نظریات اور پیسے کے زیر تسلط ان اداروں کو طویل عرصے سے امریکی اثر و رسوخ کی گاڑی کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے۔ اور سٹیسر لکھتے ہیں، "ابھرتی ہوئی معیشتیں جیسے چین، روس، بھارت، سعودی عرب، کوریا اور برازیل کو آئی ایم ایف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ وینزویلا نے آئی ایم ایف سے جان چھڑانے میں ارجنٹائن کی مدد کی۔ ورلڈ بنک کے قرضوں کا متبادل چین کی مالی امداد بن گئی۔ یہ ممالک عالمی بنک کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ سعودی عرب پہلے ہی لبنان کی پشت پناہی کر رہا ہے۔" اس سے بھی بہتر مثال کے لیے نومبر 2008 کے واشنگٹن ڈی سی میں ہونے والے G20 سربراہی اجلاس کی رپورٹ دوبارہ پڑھیں۔ پہلے مالی بحران کو IMF، ورلڈ بینک، یا G7 (اور، بعد میں، G8) نے سنبھالا تھا۔ ماضی کے ان بحرانوں میں، مغرب نے سخت اسکول ٹیچر کا کردار ادا کیا۔ اور ترقی پذیر ملکوں کو اپنے کنٹرول میں رکھا۔ عالمی بنک اور آئی ایم ایف کے دیے ہوئے اسباق اب غیر معتبر معلوم ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ ایشیائی مالیاتی بحران کے دوران امریکہ اور دیگر مغربی ممالک نے ایشیائی ملکوں سے تین اقدامات کا مطالبہ کیا تھا: خراب بینکوں کو ناکام ہونے دیں، اخراجات کو کنٹرول میں رکھیں اور شرح سود کو بلند رکھیں۔ حالانکہ جب بھی مغربی ملکوں میں ایسا بحران آیا تو مغرب نے اس کے بالکل برعکس کیا۔

چین، روس، بھارت، سعودی عرب کوریا، برازیل مل کر عالمی بینک کو ناکام کر سکتے ہیں

بہرحال ایشیائی بحران ایسا تھا جس سے مغرب خود نمٹ نہیں سکتا تھا۔ ایک انتہائی مربوط عالمی معیشت میں موثر ردعمل کے لیے، دنیا کے تمام بڑے کھلاڑیوں بشمول سرفہرست ابھرتی ہوئی معیشتوں کو حصہ لینے کی ضرورت تھی۔ نقدی کی فراہمی کے لیے چین اور سعودی عرب جیسے ممالک اہم تھے۔ جہاں تک قانونی حیثیت کا تعلق ہے، پرانے مغربی کلب قدیم تھے۔ اب وہ اپنے طور پر عالمی بحرانوں کا کوئی حل نہیں بیچ سکتے تھے۔ اس بحران سے واضح ہوگیا کہ امریکہ بھی آزادانہ طور پر کام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا پہلی بار G20 کے سربراہان حکومت کا اجلاس G8 کے بجائے بلایا گیا۔ یہ بڑی ابھرتی ہوئی اقوام کا اجلاس تھا۔ یہ واضح ہوگیا کہ بالکل سے سب کچھ تبدیل نہیں ہوا۔ G20 کا اجلاس بھی واشنگٹن میں منعقد ہوا اور صدر جارج ڈبلیو بش کو ایجنڈا ترتیب دینے میں اہم کردار ادا کرنا پڑا۔ یہ ایک نیا فارمولا تھا۔

دنیا میں اب بہت بڑی تبدیلیاں آچکی ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ اس جہاں سے امریکہ کو نکال دیا گیا ہو۔ درحقیقت، امریکہ اب بھی دنیا کا واحد اہم ترین ملک ہے جو ہر دائرے اور ہر براعظم پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کے قابل ہے۔ کوئی دوسری بڑی طاقت ایسا نہیں کر سکتی۔ جرمن مصنف جوزف جوف کے الفاظ میں، "ایک ملک ہمیشہ (یعنی امریکہ) پہلے سے طے شدہ سپر پاور" رہتا ہے۔ لیکن اب ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جس میں مشترکہ عمل نا صرف مطلوب ہے بلکہ ضروری ہے۔

سب متحد رہو:

بین الاقوامی تعاون ایک مشکل کام ہے۔ جہاں مرضی ہو، وہاں اکثر کوئی واضح راستہ نہیں ہوتا۔ افغانستان

نظریاتی طور پر ایک کامیاب کثیر الجہتی آپریشن کا نمونہ تھا۔ ابتدائی حملہ کو اقوام متحدہ اور عالمی برادری کی حمایت حاصل تھی۔ جو مشترکہ فوجی مم جوئی ہوئی اس میں برطانیہ، کینیڈا، پولینڈ حتیٰ کہ فرانس کے فوجی بھی شامل تھے۔ عالمی بینک، یوایس ایڈ، اور قومی حکومتوں نے افغانستان کے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر نو کے لیے اربوں ڈالر دیے۔ پھر بھی افغانستان میں ناکامی ہوئی۔ امریکہ اور اتحادیوں کی سرپرستی میں بننے والی حکومتوں کا ملک کے ایک تہائی سے بھی کم حصے پر کنٹرول تھا۔ کابل سے باہر، باغی جنگی سرداروں کی حکومت پورے اختیارات کے ساتھ موجود رہی۔ طالبان، اگرچہ کمزور ہوئے لیکن کابل سے باہر ان کی حکومت تھی۔ افیون ملک کی سب سے بڑی برآمد بن چکی۔ زیادہ تر مما لک، پاکستان جیسی سرحدی ریاستوں سے لے کر جو مٹی جیسے یورپی شراکت داروں تک، امریکی افغان پالیسیوں کو قبول نہیں کرتے تھے اور اس جنجال سے نکل بھاگنے کے لیے بے چین تھے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ قوم پرستی اکثر روشن بین الاقوامیت کو جنم دیتی ہے۔ افغانستان کا سبق یہ بتاتا ہے کہ کثیر الجہتی نہ تو آسان ہے اور نہ ہی ہمیشہ موثر۔ نتیجہ میں افغانستان میں عالمی کوششوں کو بش انتظامیہ کی توجہ کی کمی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک سادہ سی مثال لیں۔ جیسے عالمی سطح پر جو متعدی بیماری نے وبائی شکل اختیار کی اس کو دور دور تک پھیلنے سے روکنے کے لیے عالمی اقدامات کی ضرورت تھی۔ عالمی ادارہ صحت کو آگے آنا پڑا۔ وائرس کے نمونے اس کو بھیجے گئے۔ عالمی ادارہ صحت نے قطعی تشخیص کی اور پیروی کے لیے پروٹوکول مقرر کیا۔ بدقسمتی سے اس کے پاس فنڈز کم تھے اور اس کا انتظام

بھی نہیں کیا گیا۔ اس کے پاس ایسے قوانین بنانے کا اختیار نہیں تھا جن پر سب کو عمل کرنا چاہیے تھا۔ چین نے اپنی سرحدوں کے اندر ابوین انفلوئنزا کے پھیلنے کو ہفتوں تک چھپا رکھا، اس سے پہلے کہ دنیا اس کی گرفت میں آ گئی۔ انڈونیشیا نے ایک موقع پر فلو کے نمونے واپس کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ وہ مہنگی ویکسین بنانے کے لیے استعمال ہوں گے جس کا ان کا ملک متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ (گویا اسے مغربی ملکوں کی دوا ساز صنعت پر اعتبار نہیں تھا۔)

یہ وہ دنیا ہے جو امریکی صدر کی طرف ہر مسئلے کے حل کے لیے دیکھتی ہے۔ بڑی طاقتوں کے درمیان جنگ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اب تک کے سب سے پر امن دور سے گزرے ہیں۔ القاعدہ، ایکسویں صدی کا پہلا بڑا خطرہ تھی جو دنیا بھر کے مسلمانوں میں تشدد کی تبلیغ کرتی تھی لیکن اسے پسپا کر دیا گیا۔ باراک اوباما کا انتخاب، دنیا بھر میں تہلکہ مچانے والا تھا۔

ایک مسلمان باپ اور حسین کے درمیانی نام کے ساتھ کثیر النسل امریکی صدر کے انتخاب نے دہشت گرد گروہوں کو حیران کر دیا۔ ایک ویڈیو میں، القاعدہ کے رہنماؤں نے نئے امریکی صدر کے خلاف بے جا ذاتی حملوں کا سہارا لیا اور انہیں "ہاؤس نیگرو" قرار دیا۔ ان کی پریشانیاں قابل فہم تھیں: اوباما کا انتخاب دنیا بھر کے لیے امید کی علامت اور القاعدہ کے نفرت انگیز نظریے کے لیے خطرہ تھا۔

یقیناً یہ پرانی فکر ہے کہ تبدیلی روکنے کے لیے امن کا تختہ الٹ دیا جائے۔ تھوسیڈائڈز نے مشاہدہ کیا کہ اسپارٹا سے ایتھنز میں اقتدار کی تبدیلی پیلوپونیشیائی جنگ کی بنیادی وجہ تھی۔ امریکہ تیزی سے ڈوب نہیں رہا اور نہ اس کی جگہ کوئی دوسرا ملک لینے والا ہے۔ پوری دنیا اس بحران میں بام متحد ہے۔ دوسرے ممالک استحکام اور اقتصادی ترقی کے عمل میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ روس چار جیا تنازع کے دوران امریکی صدر نہیں بلکہ فرانسیسی صدر نکولس سرکوزی ماسکو گئے تھے۔ جب اسرائیل اور شام نے گزشتہ موسم گرما میں بات چیت کی تو یہ ترکی ہی تھا جس نے امن کے دلال کا کردار ادا کیا، واشنگٹن کو آگے نہیں آنا پڑا۔ جب لبنانی دھڑے بندوقوں اور تشدد کے ساتھ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے تو قطر کے شیخ ہی انہیں مذاکرات کی میز پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ ان میں سے کسی بھی معاملے میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کو شامل نہیں کیا گیا۔ دس سال پہلے یہ ناقابل تصور تھا آج یہ عام سی بات ہے۔ اگرچہ ایک زیادہ زور آور دنیا کا مطلب ہے زیادہ مخالف۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ زیادہ مذاکرات کرنے والے علاقائی رہنما جو امن کو برقرار رکھنے میں حصہ لیتے ہوں۔ اگر اس جذبے کی حوصلہ افزائی کی جائے تو دنیا امن کے لیے ایک بہتر جگہ بن جائے گی۔ زیادہ تر بڑی طاقتیں امریکہ کے ساتھ بنیادی مفادات اور نظریات کی بنیاد پر اشتراک کرتی ہیں۔ اس اشتراک اور مشترکہ مراعات کو برقرار رکھنا چاہئے۔

دنیا زیادہ استحکام اور خوشحالی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اصل خطرہ یہ ہے کہ واشنگٹن اپنا ہاتھ ہلکا کرے گا تو افراتفری اور عدم استحکام پیدا ہوگا یا وہ اپنا ہاتھ زیادہ استعمال کرے گا تو دوسرے ممالک ناراض ہو جائیں گے اور اس کی مخالفت کریں گے۔ امریکی سیاسی اور فوجی طاقت کا برقرار رہنا عالمی استحکام کے لیے ضروری ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ایسے قوانین، ادارے اور خدمات فراہم کرنی چاہئیں جو دنیا کے بڑے مسائل کو حل کرنے میں مدد کریں۔ جبکہ دوسرے ممالک یعنی اہم ابھرتی ہوئی طاقتوں کو اس نظام میں اپنا حصہ ادا کرنے دیں۔

عالمی مسائل کے حل میں اب امریکی کردار ضروری نہیں رہا

حالیہ دہائیوں میں امریکہ نے یہ قیادت فراہم نہیں کی اور پیرس، لندن، ماسکو، بیجنگ، اور نئی دہلی نے بھی اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ یورپ IMF اور دیگر فورمز کو اقتدار سونپنے سے گریزاں رہا اور بہت سے ابھرتی ہوئے منڈی والے ممالک اپنی خودمختاری کی اتنی ہی غیرت کے ساتھ حفاظت کرتے ہیں جس طرح امریکہ کرتا ہے بلکہ اکثر اس سے بھی زیادہ مزاحمت کرتے ہیں۔ جو بھی قصوروار ہو، جب تک ہم معاشیات، توانائی، موسمیاتی تبدیلی، بیماریوں، مہنگائی، ہجرت، اور دیگر کئی مسائل کے بارے میں عالمی تعاون کے قوانین نہیں بنائیں گے اور اداروں کو وسعت نہیں دیں گے اور بڑھانے کے طریقے تلاش نہیں کریں گے دنیا مزید بحرانوں کا سامنا کرے گی۔ حکومتی ردعمل جلد بازی اور ایڈہاک ہوں گے اور مسائل کے حل میں بہت دیر لگے گی۔ ہم موجودہ بحران سے اس وقت تک حقیقی طاقت کے ساتھ نہیں نکل سکتے جب تک کہ دنیا کے بڑے ممالک مل کر بڑے پیمانے پر اور پائیدار پیمانے پر کام نہ کریں۔

اگر ہم اکٹھے ہو کر انسانیت کے مشترکہ مسائل پر کام کریں تو تصور کریں کہ اس سے سب کے لیے کون سے مواقع پیدا ہوں گے؟ ذرا تصور کریں کہ اگر ہم نے سڑک بنانے کے نئے اصول بنائے ہیں جو عالمگیریت اور ترقی کے اس غیر معمولی عمل کو برقرار رکھنے اور معاشرے کے ہر طبقے تک پھیلانے کی اجازت دیتے ہیں، تو غریب ترین ملکوں کا معیار زندگی اور صحت کا معیار بلند ہوگا اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی صلاحیتوں کو فروغ دینے کی اجازت مل سکے گی۔

اگر ہم مل کر کام کریں اور اس بحران کی پروا نہ کریں تو مسائل کے حل کے لامتناہی مواقع ملیں گے۔ عالمی معیشت ہر جگہ لوگوں کے لیے ایک باوقار زندگی کا وعدہ فراہم کرتی ہے۔ جدید مواصلات ہم سب کو ایک دوسرے کو جاننے اور ایک دوسرے سے سیکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں تھا۔ سیاسی تعاون عظیم طاقتوں کی دشمنیوں کی آگ پر قابو پا سکتا ہے۔ لوگ زمین پر ہر جگہ ہر روز حیرت انگیز کام کر رہے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ان کی حکومتیں انسانی ذہانت کو جدید اختراعات سے ہم آہنگ کریں اور تعاون کی نئی شکلیں بنائیں۔ امریکی صدر اور دیگر عالمی رہنماؤں کے سامنے بڑا چیلنج بین الاقوامی تعلقات کا ایک نیا نظام تشکیل دینا ہے جو عظیم مشترکہ مسائل پر حقیقی اور موثر عالمی تعاون پیدا کرے۔ یہ اکیسویں صدی کا عظیم منصوبہ ہے: ایک نیا فن تعمیر جو دنیا کے لیے امن، ترقی اور آزادی کو یقینی بنائے۔ (جاری ہے) ❁

حسینہ واجد کے جماعت اسلامی پر مظالم

”بنگلہ دیش میں حسینہ واجد نے انتہائی سفاک پالیسیاں اختیار کیں۔ بزرگ رہنمائوں اور علما کو پھانسیاں دی گئیں۔ 1971 میں مشرقی پاکستان کی جماعت اسلامی کا ایک اپنا کردار تھا۔ ہم نے جماعت اسلامی کے میڈیا کے سینئر رکن شاہد شمسی صاحب سے درخواست کی کہ حسینہ واجد شیخ نے اپنے تینوں ادوار میں جماعت اسلامی کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا۔ اس پر ایک مختصر تحقیقی تحریر عنایت کریں۔ ہم شکر گزار ہیں کہ انہوں نے محمد وقاص خان کے ذمے یہ تحریر کی۔ وہ نذر قارئین ہے۔“

بنگلہ دیش کا مستقبل جماعت اسلامی کے ساتھ وابستہ

تحقیق وتحریر: محمد وقاص خان

جماعتِ اسلامی بنگلہ دیش پر حسینہ واجد کی حکومت کے دور میں کیے جانے والے مظالم اور جماعت کی قیادت کو سنائی گئی پھانسیاں:

پسِ منظر

بنگلہ دیش کی سیاسی تاریخ میں جماعتِ اسلامی ایک اہم کردار کی حامل رہی ہے۔ 1971 کی جنگِ آزادی میں جماعتِ اسلامی پر پاکستان کا

بالآخر 2024 میں جماعت کے کارکنوں اور قیادت کی قربانیاں رنگ لے آئیں

ساتھ دینے اور بنگلہ دیش کی آزادی کی مخالفت کے الزامات عائد کیے گئے۔ 2009 میں جب شیخ حسینہ واجد نے عوامی لیگ کی قیادت میں حکومت سنبھالی تو انہوں نے جماعت اسلامی کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا۔ حسینہ واجد کا یہ اقدام ان کے سیاسی ایجنڈے کا حصہ تھا جس کے تحت وہ بزعم خود جنگی جرائم کے مرتکب افراد کو انصاف کے کٹہرے میں لانا چاہتی تھیں۔

حسینہ واجد کی حکومت نے 2009 میں ”انٹرنیشنل کرائمز ٹریبونل“ قائم کیا، جس کا مقصد 1971 کی جنگِ آزادی کے دوران ہونے والے جنگی

عبدالستار ملّا۔ مطیع الرحمن نظامی۔ علی احسن محمد مجاہد۔ صلاح الدین قادر۔ چوہدری قمرالزماں کو پھانسیاں دی گئیں

جرائم کی تفتیش اور مقدمات کی سماعت تھا۔ اس ٹریبونل نے جماعت اسلامی کے کئی اہم رہنماؤں کو جنگی جرائم کے تحت سزائیں سنائیں۔

کلیدی مقدمات

عبدالقادر ملا*: جماعتِ اسلامی کے اسسٹنٹ سیکریٹری جنرل، جنہیں 2013 میں جنگی جرائم کا مجرم قرار دیا گیا اور انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسی کو 1971 کے جنگی جرائم کے تحت پھانسی دی گئی۔

مطیع الرحمن نظامی: جماعتِ اسلامی کے امیر، جنہیں 2016 میں پھانسی دی گئی۔ انہیں جنگی جرائم، قتل اور نسل کشی کے جھوٹے الزامات کے تحت مجرم قرار دیا گیا۔

علی احسن محمد مجاہد: جماعتِ اسلامی کے سیکریٹری جنرل، جنہیں 2015 میں جنگی جرائم اور اقلیتوں کے قتل کے جھوٹے الزامات کے تحت پھانسی دی گئی۔

صلاح الدین قادر چوہدری: اگرچہ وہ بنگلہ دیش نیشنل پارٹی (بی این پی) کے رکن تھے، لیکن ان پر جماعتِ اسلامی کے ساتھ وابستگی کے باعث جنگی جرائم کے الزامات عائد کیے گئے اور 2015 میں پھانسی دی گئی۔

قمر الزمان: جماعتِ اسلامی کے اسسٹنٹ سیکریٹری جنرل، جنہیں 2015 میں جنگی جرائم اور نسل کشی کے الزامات کے تحت پھانسی دی گئی۔

جماعتِ اسلامی پر مظالم

جماعتِ اسلامی پر حسینہ واجد کے دورِ حکومت میں جاری مظالم میں سیاسی پابندیاں، کارکنان کی گرفتاریاں، اور تنظیم پر حملے شامل تھے۔ جماعتِ اسلامی کے کئی دفاتر پر حملے کیے گئے اور ان کی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کی گئیں۔

سیاسی پابندیاں

- جماعتِ اسلامی پر انتخابات میں حصہ لینے پر پابندی عائد کی گئی اور ان کی سیاسی سرگرمیوں کو محدود کیا گیا۔
- تنظیم کے کئی رہنماؤں اور کارکنان کو بلاجواز گرفتار کیا گیا اور انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں

- انسانی حقوق کی تنظیموں نے بنگلہ دیش حکومت پر الزام لگایا کہ وہ جماعتِ اسلامی کے خلاف کارروائیوں میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی مرتکب ہو رہی ہے۔
- ٹریبونل کی کارروائیوں پر بھی اعتراضات کیے گئے کہ وہ شفافیت اور انصاف کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

عالمی برادری کا ردِ عمل

جماعتِ اسلامی کے رہنماؤں کو پھانسی دینے پر عالمی برادری کی طرف سے شدید ردِ عمل سامنے رہا:

- *انسانی حقوق کی تنظیمیں*: ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ہیومن رائٹس واچ جیسے اداروں نے ان ٹرائلز کی مذمت کی اور انہیں غیر منصفانہ قرار دیا۔
- *اقوامِ متحدہ*: اقوامِ متحدہ نے بنگلہ دیش حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ان ٹرائلز میں شفافیت اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرے۔
- *بین الاقوامی میڈیا*: بین الاقوامی میڈیا نے بھی ان پھانسیوں پر سخت تنقید کی اور انہیں سیاسی انتقام کی ایک شکل قرار دیا۔

حسینہ واجد کا زوال

حسینہ واجد کی حکومت کو حالیہ برسوں میں بڑھتے ہوئے دباؤ اور سیاسی بحران کا سامنا رہا:

- *سیاسی عدم استحکام*: بنگلہ دیش کی سیاست میں بڑھتی ہوئی کشیدگی

انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں نے ان مقدمات کو غیر منصفانہ قرار دیا تھا

اور مخالف جماعتوں کی جانب سے احتجاجی تحریکوں نے حکومت کو مشکلات کا شکار کیا ہے۔

- *بین الاقوامی دباؤ*: انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور جمہوری اقدار کی پامالی کے باعث بین الاقوامی برادری کی جانب سے بھی دباؤ بڑھا۔
- اس سیاسی گھٹن کی فضا میں طلبہ تحریک اٹھی اور بر سوکالا واپھٹ پڑا اور بالآخر حسینہ واجد کو استعفیٰ دیکر ملک سے فرار ہونا پڑا۔**

جماعتِ اسلامی پر حسینہ واجد کی حکومت کے دور میں کیے جانے والے مظالم اور جماعت کی قیادت کو دی جانے والی پھانسیاں بنگلہ دیش کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ان پر سیاسی انتقام کے الزامات بھی عائد کیے جاتے رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کے کارکنان کا صبر اور استقامت اور لیڈر شپ کی قربانیاں رنگ لے آئی ہیں۔ بنگلہ دیش کا مستقبل جماعت اسلامی کے ساتھ وابستہ نظر آرہا ہے۔ ❁

قائداعظم کے ذاتی معالج کی بیٹی

عطرت بتول نقوی کی عنایت ہے کہ انہوں نے ایک انتہائی اہم تاریخی شخصیت یاسمین بخاری سے اپنی خصوصی گفتگو کے لیے 'اطراف' کو منتخب کیا۔ سوال جواب میں اس انٹرویو میں کئی دہائیوں کی تاریخ محفوظ ہو گئی ہے۔ یاسمین بخاری صاحبہ کے والد محترم ڈاکٹر ریاض علی شاہ قائد اعظم کے ذاتی معالج بھی تھے۔ دوست بھی۔ ایشیا کے اس عظیم قائد کے آخری لمحات کے عینی شاہد بھی۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

مجھے فخر ہے۔ قائداعظم نے میرے سر پر ہاتھ رکھا

تحریر: عطرت بتول نقوی

یاسمین بخاری صاحبہ کا ایک اہم خانوادہ سے تعلق ہے ان کے والد ڈاکٹر ریاض علی شاہ قائداعظم کے ذاتی معالج تھے آخری وقت میں بھی قائداعظم کے ساتھ ایمبولینس میں موجود تھے یاسمین بخاری صاحبہ کا بچپن قائداعظم اور فاطمہ جناح کے ساتھ گزرا وہ خود بہت قابل خاتون ہیں بہترین مصورہ، شاعرہ اور سوشل ورکر ہیں گزشتہ دنوں ان سے بات چیت کی گئی جو، اطراف، کے قارئین کی نذر ہے (عطرت بتول نقوی)

اسلام علیکم، یاسمین صاحبہ کیسی ہیں؟

الحمدللہ، بالکل ٹھیک

کچھ اپنی تعلیم کے بارے میں بتائیے کن اداروں سے تعلیم حاصل کی؟

کانونٹ جیسز اینڈ میری اور اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور سے فائن آرٹس سٹڈیز میں تعلیم مکمل کی

پہلی پینٹنگ کب بنائی؟

میرے والد نے قائداعظم کا علاج بھی رازداری سے کیا

پہلی پینٹنگ دس سال کی عمر میں بنائی جو والد صاحب نے دیکھی اور اینا مولکا کو دکھائی (اینا مولکا احمد مشہور مصورہ اور پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ فائن آرٹس کی بانی)

اور پھر مصوری میں میں اینا مولکا صاحبہ کی پرائیویٹ سٹوڈنٹ رہی کانونٹ میں تعلیم اور فائن آرٹس میں دلچسپی کے باوجود اردو شاعری کی طرف کیسے آئیں؟

کانونٹ میں پڑھنے کی وجہ سے میری اردو ذرا کمزور تھی وہ میں نے اپنی والدہ صفیہ بیگم صاحبہ سے سیکھی وہ لکھتی تھیں شاعری بھی کرتی تھیں میرے ننھیال کا ماحول بہت علمی و ادبی تھا میرے نانا ماموں سب علامہ اقبال کی شاعری کو بہت پسند کرتے تھے اور گھر میں مولانا ظفر علی خان کا بھی آنا جانا تھا شاعری میں علامہ اقبال سے متاثر ہوئی شاعری اور مصوری میں کیا قدر مشترک ہے؟

میرے خیال میں شاعر اپنے تخیل میں الفاظ سے رنگ بھر کر کے

یاسمین بخاری صاحبہ اپنی بنائی پینٹنگز کے ساتھ

غزل و نظم کہتا ہے اور مصور اپنے تخیل کو رنگوں کی صورت کینوس پر اتارتا ہے دونوں اپنے اپنے تخیل میں رنگ بھرتے ہیں

بہت خوبصورت بات ہے یاسمین صاحبہ، یہ بتائیے جب آپ نے قائداعظم کی پینٹنگ بنائی تو تخیل میں وہ کیسے تھے؟

بالکل ویسے تھے جیسے میں نے انہیں زندہ و سلامت دیکھا تھا انہیں ملی تھی اور ان کا دست شفقت آج بھی میں اپنے سر پر محسوس کرتی ہوں

یاسمین صاحبہ آپ کا پاکستان کے اہم خانوادہ سے تعلق ہے آپ کے والد محترم ڈاکٹر ریاض علی شاہ قائداعظم کے ذاتی معالج تھے اور آخری وقت میں ان کے ساتھ تھے اس حوالے سے تفصیل سے بتائیے

جب تحریک پاکستان زوروں پر تھی تو ان دنوں میری عمر سات آٹھ سال تھی اتنا بچہ سمجھ دار ہوتا ہے اسے سب یاد ہوتا ہے میں نے اپنے گھر میں قائداعظم اور پاکستان کا بہت نام سنا تھا میں سب بچوں کو جمع کر لیتی تھی اور جلوس نکالتی تھی بلیپرز کے بچے بھی آ جاتے تھے اور میری قیادت میں سب بچے مل کر نعرے لگاتے تھے

لے کے رہیں گے پاکستان
دینا پڑے گا پاکستان
پاکستان ہمارا ہے
جان سے بڑھ کر پیارا ہے

یاسمین بخاری صاحبہ کی 23 مارچ 2024ء کی تصویر

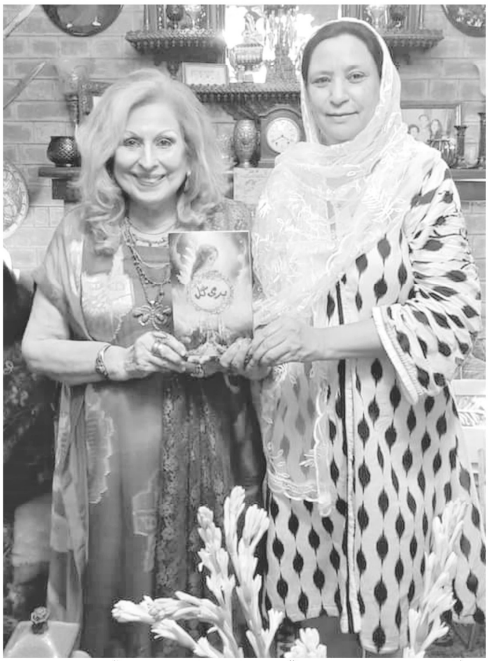

بہت جوش وخروش کا عالم تھا میرے تصور میں پاکستان ایسا تھا کہ جہاں پھول کھلے ہونگے اور بہت خوبصورت ہوگا جہاں مسلمان خوش رہیں گے اور قائداعظم مجھے ہمالیہ سے بھی بلند لگتے تھے اور واقعی وہ بہت بڑے عظیم لیڈر تھے آج تک کوئی ایسا لیڈر نظر نہیں آیا

اور پھر ایک دن وہ بھی آیا جب ابا نے سب بچوں بڑوں کو ڈرائنگ

شاعر۔ مصور دونوں اپنے تخیل میں رنگ ہوتے ہیں

روم میں بلایا سب وہاں جمع تھے اور خاموش تھے ابا نے ریڈیو آن کردیا کچھ دیر بعد ایک آواز گونجی یہ آل انڈیا ریڈیو ہے کچھ دیر بعد اہم اعلان کیا جاے گا

اور پھر بارہ بج کر سات منٹ پر مصطفی ہمدانی نے اعلان کیا،، یہ ریڈیو پاکستان ہے،،

یہ آواز اب تک میرے کانوں سے نکلتی نہیں، سب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے، قائداعظم جب بمبئی میں تھے تو ڈاکٹر پٹیل کے زیر علاج تھے وہ ایک مہلک بیماری ٹی بی میں مبتلا تھے ڈاکٹر پٹیل نے میرے والد صاحب ڈاکٹر ریاض علی شاہ کے سپرد کردیا کیونکہ والد صاحب اس وقت برصغیر کے نامور ٹی بی سپشلسٹ تھے اور اس سلسلے میں ایوارڈ حاصل کر چکے تھے امریکہ سے انہوں نے اس بیماری پر ریسرچ کی تھی

اب وہ قائداعظم کے ذاتی معالج تھے قائداعظم نے میرے والد سے کہا تھا کہ ڈاکٹر شاہ میری بیماری کو سیکرٹ رکھنا ہے اور میرے والد صاحب نے اسے بہت راز میں رکھا قائداعظم کی حالت ایسی تھی کہ اب وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے ان کی زندگی کی جتنی مدت ڈاکٹرز نے بتادی تھی والد صاحب کے علاج کے بعد اس مدت میں کچھ اضافہ ہوا اور وہ مزید اٹھارہ ماہ زندہ رہے

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اگر جناح کی بیماری کا علم ہوجاتا تو پاکستان نہ بنتا انگریز اور ہندو یہی چاہتے تھے میرے والد صاحب نے بہت رازداری سے علاج کیا اور کسی کو ان کی حالت کی ہوا نہیں لگنے دی یہ میرے والد صاحب کی پاکستان کے لیے خدمت تھی لیکن انہوں نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا کسی بڑائی کا اظہار نہیں کیا

جب قائداعظم کراچی آ گئے اور یہیں رہنا چاہتے تھے لیکن ان کی حالت کے پیش نظر والد صاحب اور دوسرے ڈاکٹرز نے آب وہوا کی تبدیلی کے لیے انہیں کوئٹہ زیارت لے جانے کا فیصلہ کیا

کوئٹہ منتقل ہونے کے بعد ان کا علاج جاری تھا ڈاکٹرز کو بہتری کی امید تھی محترمہ فاطمہ جناح بھی ان کے ساتھ تھیں، والد صاحب قائد کے علاج کے سلسلے میں لاہور سے کوئٹہ آتے جاتے رہتے تھے چونکہ قائد ایسے انسان تھے جو دوسروں کا سوچتے تھے کسی کی تکلیف انہیں گوارا نہیں تھی انہوں نے والد صاحب سے کہا ڈاکٹر شاہ آپ کی فیملی لاہور میں ہے آپکو کوئٹہ آنا پڑتا ہے آپ فیملی کو بھی یہاں بلالیں اس

محترمہ فاطمہ جناح نے ہماری فیملی کو بھی کوئٹہ بلالیا

طرح والد صاحب نے ہمیں کوئٹہ بلوالیا ہم وہاں ملٹن ہوٹل میں رہے ان دنوں میری والدہ کی فاطمہ جناح سے بہت دوستی ہوگئی ہم بچوں کو جہاں قائداعظم تھے زیارت ریزیڈنسی میں نہیں لے جایا جاتا تھا ایک دن میں اور میرا بھائی ضد کر کے والد صاحب کے ساتھ چلے گئے اس دن قائداعظم کو وہیل چیئر پر ورانڈے میں لایا گیا ان کے ایک طرف برٹش نرس اور دوسری طرف محترمہ فاطمہ جناح تھیں انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا کہ وہ کتنے کمزور ہو گئے تھے جب میں پہلے ان سے ملی تھی تو وہ بہت شاندار نظر آرے تھے اور انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا

جب ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو انہیں کراچی واپس لایا گیا وہ اپنے جہاز میں جو پہلے ماؤنٹ بیٹن کا تھا ڈکوٹا اس میں کراچی آئے اور ایئر پورٹ سے ایمبولینس روانہ ہوئی جس میں میرے والد صاحب محترمہ فاطمہ جناح اور دوسرے ڈاکٹرز تھے اور اس سے تھوڑے فاصلے پر ہماری گاڑی تھی جس میں ہماری فیملی تھی کچھ دور جانے کے بعد ایمبولینس رک گئی اس کا پچھلا دروازہ کھلا برٹش نرس باہر آئیں فاطمہ جناح بھی اتریں ہم پریشان ہوے پھر پتہ چلا کہ ٹکنیکل فالٹ ہے ابھی دوسری ایمبولینس آجائے گی، یہاں میں ایک بات بتانا چاہتی ہوں کہ قائداعظم کا ایمبولینس میں انتقال نہیں

قائداعظم کا انتقال ایمبولینس میں نہیں ہوا تھا

ہوا اکثر لوگوں نے کہا اور یہ لکھا ہے لیکن یہ غلط ہے میں نے اپنی آنکھوں سے ایمبولینس میں قائداعظم کو دیکھا وہ بے چین تھے ہاتھ ہلا رہے تھے محترمہ سے بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے ایمبولینس کا پچھلا دروازہ کھلا تھا قائداسٹریچر پر تھے اور پیچھے ہماری گاڑی تھی میں رونے لگی اور والدہ نے مجھے تسلی دی کہ قائد کو کچھ نہیں ہوگا، پھر دوسری ایمبولینس آگئی اور ہم وہاں سے روانہ ہوئے کراچی پہنچنے کے تھوڑے دنوں بعد ایک رات محترمہ فاطمہ جناح کا والد صاحب کو فون آیا کہ کہ قائد کی طبیعت بہت خراب ہے آپ آ جائیں

میرے والد صاحب نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ جب میں وہاں پہنچا تو محترمہ فاطمہ جناح کی گود میں قائد کا سر تھا ان کا آخری وقت تھا ان کی آواز مدھم ہوگئی تھی لیکن موت سے پہلے شاید ایک سنبھالا آیا

قائداعظم کے ذاتی معالج کی بیٹی

کچھ ایسے اندر کی ظلمتوں کے نشانِ تیرہ مٹا رہی ہوں
میں سبز گنبد کی روشنی سے چراغ دل کا جلا رہی ہوں
میں ایک مدت سے تشنہ لب ہوں، مری بس اتنی سی آرزو ہے
بلا لو مجھ کو بھی در پہ آقا! میں کب سے آنسو بہا رہی ہوں
ترے عدو بھی، تری صداقت، تری امانت کو مانتے ہیں
میں اس لیے بھی تری نبوت کے گیت ہونٹوں پہ لا رہی ہوں
مرے غموں کو تو دور کرنا، مری دعا کو قبول کرنا
ترے بھروسے، ترے سہارے یہ ہاتھ اپنے اٹھا رہی ہوں
مرے مقدر کے سب اندھیرے، عرب کے شاہا! تو دور کر دے
میں خب سے نورِ سحر کی خاطر لہو دِیوں میں جلا رہی ہوں

(یاسمین بخاری)

مجھ سے ہر لحظہ تری باتیں کیا کرتی ہیں
تتلیاں میرے تعاقب میں رہا کرتی ہیں
میری آنکھوں میں ترا چاند سا چہرہ بھر کے
دودھیا کرنیں مری مانگ بھرا کرتی ہیں
جب سے تھاما ہے مرا ہاتھ تری چاہت نے
منزلیں میرے قدم چوم لیا کرتی ہیں
اپنے ماضی میں ذرا جھانک کی دیکھا تو کھلا
لڑکیاں پیار کے امکاں پہ جیا کرتی ہیں
تیرے آنے کی خبر پا کے شگفتہ کلیاں
ہار خوشبو کے مرے ساتھ بُنا کرتی ہیں
دل تیرے قرب سے کچھ ایسے مہک اٹھا ہے
دھڑکنیں پھول کی مانند کھلا کرتی ہیں
یاسمین ان کے لبوں پر ہے تبسم ایسے
جیسے موتی کی شعاعیں سی ہوا کرتی ہیں

(یاسمین بخاری)

آس کے سائے جہاں یاس میں ڈھل جاتے ہیں
جتنے بھی پختہ ارادے ہوں پگھل جاتے ہیں
شام ہوتے ہی چلی آتی ہیں یادیں ان کی
شام ہوتے ہی دیے درد کے جل جاتے ہیں
رہ نما جب سے محبت کو بنایا ہم نے
جب بھی گرتے ہیں رہِ غم میں سنبھل جاتے ہیں
راہ الفت میں اگر ساتھ کسی کا مل جائے
زندہ رہنے کے سب انداز بدل جاتے ہیں
آج بھی ہم میں ہے موجود ہمارا بچپن
آج بھی ہم تو کھلونوں سے بہل جاتے ہیں
سر پہ اوڑھی ہے دعا ماں کی جو چادر کی طرح
رنج و آلام جہاں آتے ہیں ٹل جاتے ہیں
آج کے لوگ تو دو چار قدم ہی چل کر
چھوڑ کر راستے میں راہ بدل جاتے ہیں

(یاسمین بخاری)

اوران کے آخری الفاظ تھے ''اللہ اور پاکستان۔''

یاسمین صاحبہ، آپ خوش قسمت ہیں آپ نے عظیم لیڈر کو نہ صرف دیکھا بلکہ آپ کا بچپن ان کے ساتھ گزرا کچھ محترمہ فاطمہ جناح کے بارے میں بتایئے؟

فاطمہ جناح بہت گریس فل، بہت اچھی شخصیت کی مالک تھیں ہمیشہ سفید یا گرے لباس میں ملبوس ہوتیں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں لاہور میں ہمارا فارم ہاؤس تھا دلکشا گارڈن وہ جب بھی لاہور آتیں وہیں ٹھہرتیں اور میں سب سے پہلے جا کر ان سے ہاتھ ملاتی میرا دل چاہتا تھا میں بھی ان جیسی بنوں ایک دن میرا دل چاہا میں ان کے سفید خوبصورت لباس کو ہاتھ لگا کر دیکھوں میں نے ان کی چادر کو چھوا تو انہیں مجھ پر پیار آیا انہوں نے مجھے پیار کیا اور کہا تم بڑی ہو جاؤ گی تو اپنے ملک کے لیے کام کرنا، اور مجھے امید ہے تم ضرور کرو گی

میں وطن کی خدمت کے لیے امریکہ سے پاکستان واپس آئی ہوں

یاسمین صاحبہ اب اپنے سوشل ورک کے بارے میں بتایئے اس سلسلے میں آپ کی بہت خدمات ہیں؟

میں امریکہ میں پندرہ سال رہی ہوں وہاں سے صرف اپنے وطن کی خدمت کے لیے واپس آئی ہوں اس کا سہرا شمسی صاحب کو جاتا ہے وہ میرے استاد بھی ہیں ہم نے مل کر ،، آرٹ اینڈ لائف ،، کے نام سے ادارہ بنایا جس کے تحت غریب بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے اور گھر گھر جا کر مستحق لوگوں کی مدد کی جاتی ہے، غریب جھگیوں والوں کی مدد کی جاتی ہے ،، آرٹ اینڈ لائف ،، کے پریذیڈنٹ زاہد شمسی صاحب اور میں وائس پریزیڈنٹ ہوں

یاسمین صاحبہ نئی نسل کے لیے کوئی پیغام؟

مادرِ ملت ہمیشہ سفید یا گرے لباس میں ہوتیں

میں ساری دنیا میں گھومی ہوں لیکن میں نے اپنی پوتھی کو سب سے اچھا پایا یہ سب کر سکتے ہیں بس انہیں قائداعظم کے سنہری اصولوں، اتحاد، ایمان، تنظیم کو اپنانا ہوگا

زہر کیسا ہے یہ فضاؤں میں؟
سانس رکنے لگا ہواؤں میں
پھیل جاتے ہیں اشک دامن پر
دیکھ کر تشنگی گھٹاؤں میں
ایک نانِ جویں کی خاطر میں
بٹ گئی کس قدر خداؤں میں
کون رکھے گا ہاتھ دھڑکن پر
کون بیٹھے گا دل کی چھاؤں میں
رات' دن سے ترا پتا پوچھا
اور کس کس کو آزماؤں میں
چیخ اٹھتی ہے میری مجبوری
بے بسی دیکھ کر نواؤں میں
یاسمین اس بلا کی دھوپ ہے اب
چھاؤں ملتی نہیں ہے چھاؤں میں

(یاسمین بخاری)

میرا خیال ہے اب میں ہی زندہ ہوں جس نے پاکستان بنتے دیکھا ان دنوں کا جوش و جذبہ محسوس کیا اور قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح جیسی عظیم شخصیات کو قریب سے دیکھا والد صاحب قائداعظم کے صرف پرسنل ڈاکٹر ہی نہیں دوست بھی تھے اور انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کے الیکشن کے دنوں میں ان کی حمایت میں ورک بھی کیا تھا پھر میرے نانا اور ماموں علامہ اقبال کی زندگی میں ان سے مل چکے تھے اور گھر میں علامہ اقبال کی شاعری کا بہت ذکر ہوتا تھا سب انہیں بہت پسند کرتے تھے پھر پاکستان اور قائداعظم کا بہت ذکر ہوتا تھا اس کے علاوہ مولانا ظفر علی میرے والد کے پیشنٹ بھی تھے پڑوس میں رہتے تھے ان کے گھر بھی آنا جانا تھا ان کی شاعری اس وقت میری سمجھ میں نہیں آتی تھی، بس ان عظیم شخصیات کے ساتھ گزرا میرا بچپن بہت حسین تھا اور میں انہی یادوں کے ساتھ زندہ ہوں اور نئی نسل سے تو قع

میری نانا ماموں علامہ اقبال سے مل چکے ہیں

ہے کہ قیام پاکستان کے لیے دی گئی قربانیوں کو فراموش نہیں کریں گے اپنے شوہر محترم اور بچوں کے بارے میں بتایئے؟

میرے شوہر بریگیڈیئر ریٹائرڈ سید سجاد بخاری صاحب ستارہ امتیاز حاصل کر چکے ہیں بیٹا ڈاکٹر احمد جمال بخاری بیسٹ ڈاکٹر کے متعدد ایوارڈز حاصل کر چکا ہے دو بیٹیاں ہیں بڑی عائشہ بخاری اور چھوٹی شہرزادے بخاری

یاسمین بخاری صاحبہ آپ سے مل کر بہت اچھا لگا میں خوش قسمت ہوں کہ آپ جیسی شخصیت سے ملی اور بات چیت کی مجھے بھی اچھا لگا یہ میرے لیے اعزاز ہے، بہت شکریہ۔

ماہنامہ 'اطراف' نے ٹی وی ڈراما مافیا کو آئینہ دکھانے کی جرات کی ہے۔ سوشل میڈیا پر بھی اس کی دھوم ہے۔ قارئین 'اطراف' بھی اس بے باکی پر سلیم عمران کو داد دے رہے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اس کے لیے انہیں ڈرامے دیکھنے کی سزا بھگتنی پڑتی ہے اور پس پردہ جھانکنے کی کوشش بھی۔ 'اطراف' یہ سب کچھ اس لیے کر رہا ہے کہ پاکستانی معاشرے کو ایک آزاد خود مختار اور فعال کمیونٹی میں تبدیل کیا جائے۔ اس مافیا کے عزائم کو بے نقاب کیا جائے۔

تفریحی چینلوں میں بیٹھے عقل کے اندھے

تحریر: عمران سلیم

چینلوں میں بیٹھے کرسی نشینوں کو عقل کا اندھا تو سب ہی تسلیم کرتے ہیں (کم سے کم سوچنے والے گروہ تو لازمی ایسا ہی سمجھتے ہیں) مگر آنکھوں سے اندھا ہونا۔ یہ تو کوئی بھی نہیں سمجھتا۔ بس اب یہی سمجھنا باقی رہ گیا ہے کہ ڈرامے بنانے والے بینائی سے بھی محروم ہیں۔ موضوعات تو ایک جیسے ہیں ہی محض فنکاروں کے فرق کی وجہ سے اور ناظر خواتین کو کسی نامعلوم سازش کے تحت عقل کی چوٹیاں سر نہیں کرنے دی جاتیں۔ اس سازش کی کامیابی کی وجہ سے ان ڈراموں کا غلغہ مچا رہتا ہے۔ ایک چینل ہے ہم ٹی وی اور اسی چینل سے دو ایک جیسے ڈرامے اس طرح دکھائے جا رہے ہیں کہ مولویوں کا کردار کافی نمایاں ہے۔ دونوں ڈراموں کا کم سے کم کراچی کے کلچر اور شہریات سے تعلق نہیں ہے۔ یہ ڈرامے

عدنان شاہ ٹیپو سے ہی مولوی کا کردار کیوں؟

پنجاب کے دیہاتی علاقوں سے اخذ کئے گئے ہیں یا پھر کسی قدر لوئر کلاس کی عکاسی کی جا رہی ہے۔ دونوں ڈراموں میں مولوی ایک ہی اداکار کو بنایا گیا ہے اور وہ ہے عدنان شاہ ٹیپو۔ فرق ہے تو بہت معمولی سی لوکیشن کا ہے، ورنہ ایک ہی فنکار کو مماثل کردار میں دیکھ کر ڈراما دیکھنا کس قدر مشکل ہے یہ دیکھنے والوں سے کوئی پوچھے۔ ہم ٹی وی والوں نے کیا اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے علاوہ، اپنے دماغ سے سوچنے کے علاوہ کوئی اور کام لینے شروع کر دیے ہیں۔ زرد پتوں کا بن۔ اور من جوگی۔ یہ دونوں ڈرامے اسی ایک چینل کے ہیں اور دونوں میں ایک جیسا سماج ہے اور مولوی بھی ایک ہی اداکار کو بنایا گیا ہے۔

ظفر معراج اور کاشف نثار کی جوڑی نے بے شمار ڈرامے بنائے ہیں۔ ان سب ہی ڈراموں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ نفسیاتی بیمار

لوگوں کے لیے بنائے گئے ہیں یا پھر بنانے والے پیچیدہ نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہیں۔ اس جوڑی کے سارے ڈرامے دیکھ لیجے موضوعات مختلف ہوں تب بھی۔ ڈراموں کا ماحول ایک ہی جیسا ہوتا ہے حتیٰ کی لوکیشنز بھی وہ ہی قدیم مسترد شدہ عہد کی لگتی ہیں اور اب تو یہ ظلم اور ڈھٹائی بھی دیکھنے کو مل رہی ہے کہ اداکار بھی ایک جیسے ہیں ظاہر ہے کوئی ایک ہی ٹیم ہے۔ جو ہر ڈرامے میں قریب قریب یکساں دکھائی دیتی ہے۔ ''کابلی پلاؤ'' (کتنا غیر ڈرامائی عنوان ہے نئی جنریشن کو تو پتا تک نہیں ہوگا کہ یہ کابلی پلاؤ ہوتا کیا ہے۔) پرنٹی جنریشن کی پروا کسے ہے۔ ناظرین بھی پکے ہیں (خریدے ہوئے ووٹوں کی طرح فنکار بھی اور لوکیشنز بھی) کابلی

ظفر معراج اور کاشف نثار کی جوڑی نفسیاتی بیماروں کے لیے ڈرامے

پلاؤ کے بعد ''من جوگی'' ڈراما جو حال ہی میں ہم ٹی وی سے شروع ہوا ہے۔ اس کی اور کابلی پلاؤ کی ہیروئین ایک ہی اداکارہ ہے۔ سبینا فاروق اور چونکہ ڈائریکٹر اور رائٹر بھی ایک ہی (Same) ہیں تو سمجھیں کہ یہ ڈرامے اپنے گھر کی بات ہے۔ یہ بی بی سبینا فاروق نہ تو اداکارہ بہت اچھی ہیں اور نہ ہی خوبصورتی میں کسی ملکہ حسن کو مات کرتی ہیں۔ تو اب ان کو اس طرح اتنا زیادہ ناظرین پر مسلط کرنے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ گوہر رشید کے ساتھ بھی ہے جیسے ہی اس قسم کے گروہ کے ڈرامے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ صاحب لازمی مضمون کی طرح فکس کردیے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ اس بندے کے پاس اداکاری کے جو دو تقاضے ہوتے ہیں خوبصورتی اور ایکٹنگ دونوں سے یہ موصوف محروم ہیں۔ اس کے باجود ڈراموں میں دکھائی دیتے ہی رہتے ہیں۔ اس کی تین وجوہات

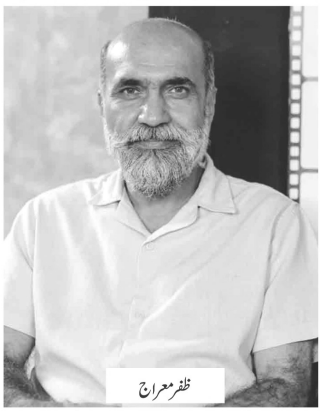
ظفر معراج

کاشف نثار

ہیں۔ پہلی یہ بندہ پیسے نہیں لیتا مفت میں کام کرتا ہے، دوسری یہ الٹا کام کرنے کے پیسے دیتا ہے۔ سنتے ہیں کچھ فنکار ایسا ماضی میں بھی کرتے رہے ہیں۔ تیسری اس کا گروپ میں آنکڑا کچھ ایسا فٹ ہے کہ گروپ جب بھی ڈراما بناتا ہے اسے لے ہی لیتا ہے۔ (مے ہو، جام ہو۔ ساقی بھی ہو تو محفل کی رونق عروج پر

سبینا فاروق کو ناظرین پر کیوں مسلط کیا جارہا ہے

ہوتی ہے) ایسا ہی تب بھی دیکھنے میں آتا ہے جب سکس سگما یعنی ہمایوں سعید کے پروڈکشن سے کوئی ڈراما بنایا جائے تو دس میں سے دو چار میں یہ گوہر نایاب لازمی موجود ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی لوگوں کو بڑی کوفت ہوتی ہے نیرا عجاز کو بھی آنکھیں بند کرکے دیکھتے ہیں بعض لوگ، پر وہ کم سے کم ایکٹنگ تو اچھی کرتا ہے۔ یہ تو اس سے بھی فارغ ہیں۔ من جوگی کا ٹاپک ''حلالہ'' معلوم ہوتا ہے کچھ عرصہ پہلے پیمرا نے اس ٹاپک پر غالباً بندش عائید کی ہوئی تھی مگر اب پھر سے اس ٹاپک کو چھیڑنا لگایا جارہا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ پیمرا نے اسی طرح کی آزادیاں

آئیندہ بھی برقرار رکھیں تو اگلے پچاس ڈرامے اس موضوع پر بننے والے ہیں۔ ناظرین کے لئے یہ کوئی اچھی خبر بہرحال نہیں ہے۔ مارکیٹ ویلو بڑھانے اور کامیابی کے سہارے کے لیے بلال عباس کو بھی کاسٹ کیا گیا ہے مگر بلال عباس اس ڈرامے میں دیکھنے کے لائق نہیں لگ رہے کم سے کم تین اپنی سوڈز تک۔ اور جو بات فی الحال مبہم ہے وہ یہ کہ مذکورہ ڈرامے کی پروڈیوسر سلطانہ صدیقی ہیں۔ جنھیں لوگ ہم نیٹ ورک کی صدر کی حیثیت میں جانتے ہیں۔ کیا ان کی تنزلی ہوئی ہے۔ جو ان کا نام پروڈیوسر کی حیثیت میں دکھایا جارہا ہے؟

زرد پتوں کا بن۔ اسے مصطفیٰ آفریدی نے لکھا ہے۔ اور سیف حسن نے ڈائریکٹ کیا ہے۔ ماضی میں لاہور کے ڈرامے زیادہ تر شہر اور گاؤں کے کلچر کے عکاس ہوا کرتے تھے۔ اس ڈرامے میں بے حساب اداکار ہیں اور سب کے سب وہ جنھیں ہمارے ہاں سپر اسٹار کہا جاتا ہے۔ سپر اسٹارز کو کسی ڈرامے میں کاسٹ کرنے کے بعد اگر کوئی رائٹر یا ڈائریکٹر یہ سمجھتا ہے کہ اس کا ڈراما کامیاب ہے تو اس کا پورا کریڈٹ اداکاروں کو ہی دیا جانا چاہیے۔ جیسے زرد پتوں میں تو ایک ڈھیر ہے جانے مانے اداکاروں کا، جس کا مطلب ہے کہ یہ ڈراما کافی مہنگا بھی بنا ہوا ہے۔ مرکزی کرداروں میں سہیل احمد کا بیٹا حمزہ سہیل اور سجل علی

فہد مصطفیٰ کو ''جیتو پاکستان'' سے ڈرامے کی طرف کیوں آنا پڑا

نمایاں ہیں اس ڈرامے کو پچاس برس سے اوپر کے لوگ کچھ نہ کچھ دیکھ ہی سکتے ہیں نئی جنریشن کا ایسی نوسٹلجیا سے کیا لینا دینا ہے۔ مصطفیٰ آفریدی نے سنگ مرمر کے بعد کوئی ڈھنگ کا کام لکھ کر نہیں دیا۔ پھر بھی وہ لاڈلے ہیں ہم ٹی وی کے فرحت اشتیاق ایسے ہی تو اے آر وائی کو پیاری نہیں ہوگئیں۔

''کبھی میں کبھی تم''۔ اس ڈرامے کو ہم ٹی وی کی فیورٹ فرحت اشتیاق نے لکھا ہے اور اسی ڈرامے سے ایک طویل مدت کے بعد فہد مصطفیٰ کی ڈراموں میں واپسی ہوئی ہے۔ جیتو پاکستان اور کچھ فلموں میں تواتر سے کام کرنے کے بعد شاید فہد مصطفیٰ نے ایسا سوچا ہو کہ اب تو وہ بڑی اسکرین کے فنکار ہیں تو ٹی وی والوں سے بڑے ہو چکے ہیں۔ جیتو پاکستان تو ایک شو ہے اور شوتو بالی ووڈ کے فنکار بھی کر ہی لیتے ہیں مگر افسوس ان کی یہ فخریہ سوچ زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوئی اور انھیں ٹی وی ڈراموں میں واپس آنا پڑا کہ کیا کریں جیتو پاکستان سے بھی لوگ بڑی حد تک عاجز آچکے تھے مگر اے آر وائی کو اپنے ناظرین کی سب سے کم پرواہ ہے ورنہ وہ جو ''بلیلے'' نام کا ایک انتہائی بوسیدہ شو مسلسل جانے کتنے برس تک زبردستی دکھایا جاتا رہا۔ اسے بہت پہلے بند ہوجانا چاہیے تھا۔ مذکورہ ڈرامے میں بھی ایسے تمام

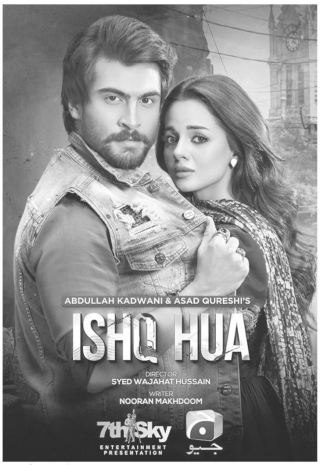

فنکاروں کا جمعہ بازار لگایا گیا ہے۔ فرحت اشتیاق کی کہانی میں کچھ بھی نیا نہیں ہے، وہ ہی دو بھائیوں کی فلمی کہانی ہے۔ جسے دیکھ دیکھ کر لوگ تھک چکے ہیں۔ اس ڈرامے کے ڈائریکٹر بدر محمود ہیں جو شدت پسندی سے مناظر شوٹ کرنے کی مہارت سے مالا مال ہیں۔

تیسرا چینل ہے جیو اور اس سے دکھائے جانے والے نئے ڈرامے کا عنوان ہے۔ ''عشق ہوا'' اس ڈرامے میں سیونتھ اسکائی کے جانشین ہارون کا دوانی مرکزی کردار میں ہیں اور یہ نوجوان سیونتھ اسکائی کے عبداللہ کا دوانی کا بیٹا ہے، سمجھو اس کے تو باپ کا راج پاٹ ہے۔ ان دنوں جیو چینل کسی معاہدے کے تحت سیونتھ اسکائی کے زیر اہتمام ڈرامے پیش کرتا ہے۔ یہ اسی نوع کا کاروباری معاہدہ ہے جیسا قبل ازیں جیو نے بابر جاوید اور آصف رضا کی پروڈکشن کمپنی کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اب دوسرا

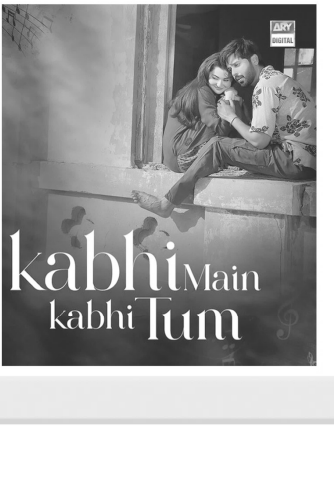

نام عبداللہ کا دوانی کے ساتھ اسد قریشی کا ہے۔

نوراں مخدوم نے ''عشق ہوا'' کو لکھا ہے۔ یہ بی بی عین مین فلمی انداز کے ڈرامے لکھتی ہیں۔ ڈرامے کے شعبے کی شدید بدقسمتی کہ اسی انداز کا ایک ڈراما ''تیرے بن'' کامیابی کے جھنڈے گاڑ چکا ہے چنانچہ اب یہ بی بی فلمی کچرا ڈھونے کے لئے پوری طرح شیر ہوچکی ہیں۔ سو عشق ہوا کا بھی یہی حال ہے۔ جب آپ فلموں سے متاثر ہوکر ڈرامے لکھتے ہیں تو ظاہر ہے ڈائریکٹر فلموں کے مناظر دھڑلے سے چوری کرتے ہیں۔ ایسی ڈھٹائی کہ سوچ کے ان کی ہمت پر رشک آتا ہے۔ انڈیا کے یوٹیوبر ایک جملہ بہت بولتے ہیں'' یا بے شرمی تیرا ہی آسرا'' تیرے بن میں سراج الحق جو اس ڈرامے کے ڈائریکٹر تھے۔ انھوں نے راجکپور کا مشہور زمانہ منظر جو مقبول ترین فلم برسات میں فلمایا گیا تھا بعد ازاں راجکپور نے اسی منظر کو اپنی فلمی کمپنی کا لوگو بنا لیا تھا تیرے بن میں اس منظر کو چوری کیا گیا اور وہاج نے یمنیٰ زیدی کو جب کمر سے پکڑ کے نرگس کی طرح ایک طرف کو جھکایا تو جن لوگوں کو برسات کا وہ منظر یاد ہے انھوں نے پاکستان کے ڈراما ڈائریکٹرز کے تخلیقی ذہن پر کس قدر ماتم کیا ہوگا یہ کہنے والی بات نہیں ہے۔ اس پر طرفہ یہ کہ مذکورہ ڈراما کامیاب اور ہٹ کہا جاتا ہے۔ ویسے انڈیا میں

پاکستانی ڈراموں میں بھارتی فلموں کے مناظر کی نقل

تاریخ کی بدترین فلمیں بھی بداتفاقی سے سپر ڈپر ہٹ ہوجاتی ہیں جیسے ''غدر ٹو اور استری ٹو''

''عشق ہوا'' اتنا زیادہ فلمی ہے کہ ایک سین جو 18 اگست کو تیسرے اپی سوڈ میں دکھایا گیا۔ اس میں لڑکی کو ایک ولن ٹائپ بندے نے قابو کیا ہوا ہے اور پہنچ جاتے ہیں ہیرو ہارون کا دوانی۔ لڑکی بہت ہی برے فلمی انداز میں ولن کے ہاتھوں سے پھسل کر چھوٹے کا دوانی کے سینے سے جا لگتی ہے۔ (ضیاء الحق کی روح اس بے حیائی پر کیسی تڑپ رہی ہوگی) ولن کے ہاتھوں میں بندوق ہے اور لڑکی کا دوپٹا ہے۔ اب دونوں ایک دوسرے سے دوپٹے کی مانگ کر رہے ہیں۔ کہ ہیرو صاحب بندوق والے کو قابو کر لیتے ہیں اور دوپٹا لڑکی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ مجھے لگا اب چھوٹا کا دوانی عین فلمی انداز میں کہے گا۔

''میں تینوں ہک گولی اس لیے ماراں گا کہ توں میری محبوبہ دے دوپٹے نوں ہتھ لایا سی''

اور دوجی گولی۔۔۔۔۔ ماضی کی فلموں میں اس طرح کئی گولیاں ولن کو ماری جاتی رہی ہیں۔ بی بی نوراں مخدوم نے ایسی کوئی فلم نہیں دیکھی ہوگی ورنہ پکا پکا یاسین ہاتھوں سے جانے تو نہ دیتیں۔ بس آنکھیں بند کر کے لکھتا ہی تو تھا! ❁

”اطراف‘ کی اس جرات کو صرف پاکستان ہی نہیں۔ سمندر پار پاکستانی بھی لائق تحسین سمجھ رہے ہیں۔ عزیزہ انجم نے ای میل سے اپنے دلی تاثرات ارسال کیے ہیں۔ کورونا میں کئی دریا بند کر دیے ہیں۔ ایسے حقیقت پسندانہ تبصروں سے ہی ہم ٹی وی ڈراما مافیا کو راہِ راست پر لا سکیں گے۔ ڈرامے تفریح بھی ہوتے ہیں۔ اور غیر محسوس طریقے سے تہذیبی اصلاح کا ذریعہ بھی۔ اپنی رائے دیجئے۔“

مناظر اسکرین پر دیکھیں گھروں میں دہرائیں

عزیزہ انجم کی جراتمندانہ تحریر

جانے آنکھیں کیا کیا دیکھیں گی اسکرین پر اور پھر یہ منظر گھر میں دہرائے جائیں گے۔

بہو کے باپ کو بہو کا میاں اور جیٹھ ٹل کر مارتے ہیں جبکہ بہو کا باپ ان کا سگا تایا بھی ہے۔ جاہ و حشم کا مالک بھی۔ مال و دولت میں عزت

60 اور 70 قسطوں تک ظالم ساس۔ بدمزاج شوہر۔ آوارہ مزاج بہو

میں اونچے رتبے اور معاشرے میں اونچے مقام والا بھی ہے۔

نوجوان بیٹے ماں کے سامنے ماں کا دل خوش کرنے کے لئے اپنے تایا کو اپنی چھوٹی بھاوج کے باپ کو ٹھڈے مارتے ہیں کے لگاتے ہیں دھکا دیتے ہیں۔۔۔۔ اور ماں۔۔ گردن اونچی کئے اپنے دل کی آگ جی بھر کر بجھاتی ہے۔

واقعہ ٹی وی ڈرامے پر نہیں دکھایا گیا بلکہ اب گھروں میں اس کی ڈرامائی تشکیل ہوگی۔ اور ہوئی ہے۔ کہیں بہو کے گھر والے اس کے سسرالیوں کو مار رہے ہیں بے عزتی کر رہے ہیں کہیں بہو کے میاں کے گھر والے۔ سگے رشتے داروں میں شادی ہوئی اور بہو کے گھر والوں نے اختلاف پر خوب ڈیل کیا بیٹی کی ساس کو۔ اگلا پچھلا سب

”خودسر“ ڈرامے کی بیٹی یا نور جہاں کی نور ماما

یاد دلا دیا۔

ابھی اسی مہینے دو بچیوں کے متعلق پتا چلا آدھی رات کو گھر سے نکال دیا کہیں میاں نے کہیں میاں ساس اور نند نے مل کر۔ بچے زرضمانت میں روک لئے کہ واپس تو آؤ گی ان کے پیچھے۔ تمہاری کیا عزت ہے دو کوڑی کی۔

ہمارے معاشرے میں جتنے تکلیف دہ واقعات ہو رہے ہیں کیا ان میں ٹی وی پر دکھائے جانے والے ڈراموں کا کوئی رول نہیں۔

ساٹھ اور ستر قسطوں تک ظالم ساس یا ظالم بدمزاج شوہر یا آوارہ مزاج بہو یا بیٹی مستقل ہر قسط میں دکھائی جاتی ہے آخری سین میں میں برا انجام۔

کیا یہ سب ٹھیک ہے۔

نور جہاں ایک با اختیار عورت یعنی empowered woman جو پاکستانی ریاست بنانا چاہتی ہے ایک بزنس وومن بڑے گھر اور بڑے پیسے والی بہوؤں سے ملازماؤں کی جگہ کام لیتی ہے بہو کو بیٹا پیدا کرنے کا حکم دیتی ہے یہ کہہ کر بیٹی کے گھر والوں کو نہ جانے کیسے کیسے خود سے نیچے لوگوں کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے دروازہ نیچا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ڈائیلاگ ہیں اس ڈرامے کے جو نور جہاں کے نام سے پیش ہو رہا ہے ابھی تو ابتدا ہے۔

ایک نیا ٹرینڈ چلا ہے برے کرداروں کو گلیمرائز کر کے پیش کرنا۔ خواہ وہ خودسر ڈرامے کی بیٹی ہو یا نور جہاں کی نور ماما۔

اور ہاں اماں یا امی کے بجائے ماں کو نور ماما کہنا۔۔۔۔

کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں

غموں کا فسانہ غموں کی کہانی۔

ہمارا ہر ڈرامہ ایک سے بڑھ کر ایک منفی کردار منفی تصویروں کا مجموعہ

پیسوں کے پیچھے لمبی قسطوں کے ڈرامے وقت گزاری اور بربادی

ہے۔ ایک قسط میں ایک سین اور بدگمانیاں سازشیں جھوٹ۔۔۔ نہ جانے کیا کیا۔

سماج کے لئے فکر کرنے والوں کو سوچنا چاہئے ان ڈراموں کے کیا نتائج ہوں گے اور ہو رہے ہیں۔

رشتوں کا بیڑہ غرق ذاتی خواہشات غلط یا صحیح اور ان کو بے دریغ پورا کرنا۔ ❁

ٹی وی ڈرامے۔گھٹیا ڈائیلاگ

”اطراف‘ نے پرائیویٹ ٹی وی ڈرامہ انڈسٹری کے مادر پدر آزاد موضوعات۔ عکاسی۔ مکالموں کے خلاف مشن کا آغاز کیا ہے۔ ہر طرف سے اس کوشش کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ ڈیفنس کراچی میں مقیم ریحانہ اعجاز ’اطراف‘ کی قلمی معاون ہیں۔ ہماری فرمائش پر انہوں نے ٹی وی ڈراموں کے مکالموں پر ایک جامع تجزیاتی تحریر سے نوازا ہے۔ آپ بھی ڈرامے دیکھتے ہیں۔ آپ بھی اس مشن میں حصّہ لے سکتے ہیں۔“

پی ٹی وی دَور کے ڈرامے۔ ہمارے تمدن کے عکاس

ریحانہ اعجاز کی بے باک تحریر

ایک وقت تھا جب” پی ٹی وی“ سے نشر کیئے جانے والے ڈرامے ہمارے ملک۔ کلچر، مذہب و اخلاقیات کو مدنظر رکھ کر بنائے جاتے تھے، تب بھی انہی موضوعات و واقعات کو ہی ڈراموں میں بیان کیا جاتا تھا جو ہمارے اردگرد جنم لیتے ہیں کہ ڈرامے میں سب کچھ نہ سہی لیکن کچھ تو حقیقت ہوتی ہے جس سے انسپائر ہو کر ہماری نوجوان نسل نیگیٹو یا پازیٹو سوچتی ہے اور بہت سے لوگ ان ڈراموں سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ان میں دکھائے جانے حالات و واقعات کو اپنی زندگی پر لاگو کر لیتے ہیں اور ایسا کرنے والے زیادہ تر ہمارے نوجوان لڑکے/لڑکیاں ہی ہوتے ہیں جو ڈراموں میں دکھائی دینے والے ہیرو/ ہیروئنز اور مصنوعی چکا چوند کے تناظر میں اپنی زندگی میں در آنے والے اپنے ہمسفر کے حوالے سے خوش آئند خواب اپنی آنکھوں میں سجا لیتے ہیں۔۔۔۔

یہی وجہ تھی کہ پی ٹی وی کے دور میں لکھنے والے تمام تر ڈرامہ رائٹرز اشفاق احمد، اصغر ندیم سید، امجد اسلام امجد، بانو قدسیہ، فاطمہ ثریا بجیا، حسینہ معین، انور مقصود، منو بھائی، نور الہدیٰ شاہ، شعیب منصور، کمال احمد رضوی، اور بہت سے نامور مصنف ان سب حقیقتوں سے پوری طرح آشنا تھے اور اپنے ڈراموں میں مخرب اخلاق چیزوں کو بھی ایسے انداز میں دکھاتے تھے جس سے سبق تو حاصل ہوتا تھا لیکن اشتہانہ جاگتی تھی۔ لغو و بیہودگی مضمر نہ ہوتی تھی ۔۔۔ پہلے بھی لو اسٹوریز ڈراموں کا حصہ ہوتی تھیں لیکن۔

ہر دوسرے ڈرامے میں لڑکے/ لڑکیوں کو گھروں سے بھاگنے کی ترغیب نہیں دی جاتی تھی“

کھلے عام شراب نوشی کا پرچار نہیں کیا جاتا تھا“

بہوؤں، بیٹیوں کو ننگے سر گھر سے باہر جانے کا سبق نہیں دیا جاتا تھا“

شرعی رشتوں کا مذاق نہیں بنایا جاتا تھا“

بہنوئی اور سالی کے رشتے کو پامال نہیں کیا جاتا تھا“

دیور بھابی کے رشتے بے لگامی کی حد و پار نہیں کرتے تھے“

سہیلیوں کے درمیان موجود دوستی کے مقدس رشتے کو اک، دو جے کے شوہر پر نظر رکھ کر رسوا نہیں کیا جاتا تھا“

جوان جہان اولاد کو کہیں بھی” ماں/ باپ“ کے سامنے سینہ تان کر عشق و عاشقی پر بحث کرتے نہیں دکھایا جاتا تھا“

میاں/ بیوی کے پاکیزہ رشتے میں بندھے نفوس کو نامحرموں کی بانہوں میں نہیں دکھایا جاتا تھا“

کبھی بھی نائٹ کلبز یا پرائیویٹ پارٹیز میں مدہوش اسٹوڈنٹس نہیں دکھائے جاتے تھے“

بیٹیاں تو کیا، بیٹوں کو بھی رات بھر گھر سے باہر گلچھرے اڑاتے نہیں دکھایا جاتا تھا اور اب۔۔۔۔ اب تو بیٹیاں بھی ماں باپ کی دسترس سے باہر اپنی من مانی کرتی دکھائی جاتی ہیں۔۔۔ ماں باپ سے پڑھائی کا بہانہ کر کے محبوب کے ساتھ ساحلِ سمندر کنارے پکنک مناتی بیٹیاں دکھا کر کون سا اخلاق سکھایا جا رہا ہے؟

> **بے راہ روی۔ خودسری۔ نافرمانی کو جنم دیتے ڈرامے**

> **شرافت کے اڑتے پرخچے۔ پیمرا خاموش تماشائی**

پاکستان کے کسی حصے میں ایسا ماحول نہیں جہاں گھر میں دو، تین جوان بیٹیاں ہوں اور ماں باپ کسی بھی راہ چلتے کو شرافت کا سرٹیفکیٹ تھما کر گھر میں کھلم کھلا دندنانے کی اجازت دے دیں اور گھر کی بیٹی اس نوجوان سے محبت کی پینگیں بڑھانا شروع کردے، آدھی رات کو چھت پر، کمرے میں، کچن میں ہر جگہ عشق لڑایا جارہا ہو اور ماں باپ سکون سے سوتے رہیں۔

اسی پر بس نہیں بلکہ جب دل چاہے بیٹی اس شریف انسان کے ساتھ دیر رات گئے سمندر پر اٹکھیلیاں کرتی رہے اور ماں باپ کے سکون میں رتی بھر فرق نہ پڑتا ہو۔۔۔۔۔۔۔۔

ان سب باتوں کے تناظر میں، میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ" پاکستانی ڈرامے" ہمیں زوال کی طرف لے جارہے ہیں ۔۔۔اخلاقی پستی کی جانب لے جارہے ہیں۔

ہر اس گھر میں جہاں پاکستانی ڈرامے بڑے ذوق وشوق سے دیکھے جاتے ہیں وہاں عدم برداشت، لڑائی جھگڑے، بے راہ روی، خودسری، نافرمانی، بے حیائی جنم لے رہی ہے کہ بہت سے ناپختہ ذہن جنہیں ابھی زندگی گزارنے کا شعور وآگہی نہیں وہ ان" مخرب اخلاق" ڈراموں میں دکھائی جانے والی مصنوعی چکا چوند سے متاثر ہوکر ہر قسم کے فعل میں خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں اور اس سب سے قطع نظر افسوس کا مقام یہ ہے کہ پوری دنیا میں (غیر ممالک) جہاں جہاں اردو بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں وہاں پاکستانی ڈرامے بھی یقیناً دیکھے جاتے ہیں۔

کیا کبھی کسی نے سوچا کہ وہاں کے رہنے والے ہمارے ملک، ہمارے مذہب کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے؟

کیا یہی ہمارا کلچر ہے؟

کیا یہ ہمارا دین ہے؟

ہمارا دین جس میں ام الخبائث کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے اب ہر ڈرامے میں سر عام شراب دکھائی جاتی ہے۔۔۔۔

نکاح" جیسے مقدس ترین فعل کو مذاق بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔۔

اُس کی بیوی اس کے ساتھ، اُس کا شوہر اس کے ساتھ؟

طلاق جسے اللہ کے نزدیک جائز فعل ہونے کے باوجود سخت ناپسند کیا گیا ہے اس کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے ڈراموں میں اور افسوس صد افسوس کہ

اس فعل کے بعد پھر" بنا" حلالہ کے ہی" جوڑے" ایک ساتھ بھی رہتے دکھائے جاتے ہیں کیا یہ مقامِ شرم نہیں؟

طوائف کے کوٹھے پر پاکیزہ کہانیاں۔کوئی قلم اٹھائے تو سہی

پوری دنیا میں اسلامی جمہوریہ کے نام پر حاصل کیئے گئے اس ملک کو، اس کے کلچر کو، مذہب کو ڈراموں کے ذریعے تماشہ بنایا جارہا ہے۔۔

ملکی ثقافت کے،شرافت کے" پرخچے" اڑائے جارہے ہیں اور" میمرا" خاموش تماشائی بنا ہوا ہے؟

بے شک پاکستانی ڈرامے ہمیں تنزلی کی طرف لے جارہے ہیں۔۔ شرعی رشتوں کا تقدس پامال کررہے ہیں، جب پی ٹی وی کے

ڈرامے دیکھے جاتے تھے تو پوری پوری فیملیز رات آٹھ بجے کا انتظار کیا کرتی تھیں اور سب ایک ساتھ بیٹھ کر ڈراموں سے لطف اٹھایا کرتے تھے، ڈرامہ دیکھنے کے بعد اس کے اچھے برے پہلوؤں پر بحث کیا کرتے تھے۔۔۔

جبکہ آج کل ڈرامے تو دور کی بات اشتہارات بھی اس لائق نہیں کہ

'نکاح' کا مذاق۔ طلاق بے دریغ

بندہ اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھے۔۔۔۔۔۔۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ہم جیسے" دقیانوسی" لوگوں کو ڈرامہ دیکھتے ہوئے اگر کہیں کوئی فیملی ممبر آجائے تو چینل بدلنا پڑتا ہے ورنہ لازمی کوئی نہ کوئی سین یا" ڈائیلاگ" ایسا آجاتا ہے جب ایک دوسرے سے نظریں چرانا پڑتی ہیں۔۔۔

سوشل میڈیا سب سے بڑی طاقت ہوتا ہے اپنے ملک کی سالمیت و عزت، وقار اور اخلاق کے پرچار کا۔۔۔۔۔۔۔

لیکن لگتا ہے پاکستانی میڈیا اس بات سے بے بہرہ ہے۔

آج کل صرف اور صرف" ریٹنگ" کو اہمیت دی جاتی ہے۔۔۔

گھٹیا سے گھٹیا ڈائیلاگ لکھ کر فینس ہونے کی چاہ میں سب اخلاق کو بہت پیچھے چھوڑتے جارہے ہیں۔ اور اس سب میں قصوروار رائٹرز، ڈائریکٹرز، میمرا، کیمرہ مین، اور خود" ناظر" بھی ہے۔

رائٹرز کا قصور محض اتنا ہے کہ دولت وشہرت کی ہوس نے انہیں ہر چیز سے بیگانہ کردیا ہے اور مدہوش انسان سے" اچھائی" کی توقع عبث ہے ۔لیکن" میمرا" تو ہوش کے ناخن لے۔۔۔۔۔اس قسم کے تمام رائٹرز پر بین لگائے جو اخلاق باختہ ڈرامے لکھ رہے ہیں۔۔

بے شک دنیا میں بلکہ یوں کہہ لیں پاکستان میں حقیقت میں بہت کچھ ہورہا ہے، زنا، بدکاری، شراب نوشی، جواء۔۔۔۔ ہر برے سے برا کام بڑے بڑے ناموں کے زیرِ سایہ بخوبی جاری وساری ہے لیکن میرا سوال یہ ہے کہ کیا ضروری ہے ہم ان سب کاموں کا پرچار اپنے ڈراموں میں بھی کریں اور پوری دنیا کو بتائیں کہ ہم نام نہاد مسلمان حقیقت میں کیا ہیں؟

ان سب رذیل کاموں کے علاوہ بہت کچھ ایسا بہترین کام بھی ہورہا ہے جو پاکستانی ڈراموں میں دکھایا جانا چاہیئے جس سے یقیناً پاکستان کا نام روشن ہوگا، جیسا کہ

نوجوان نسل تعلیمی مدارج میں بے شمار کارنامے سرانجام دے رہی ہے۔۔۔ آج بھی ایسے نوجوان پائے جاتے ہیں جو محبت ضرور کرتے ہیں لیکن ماں باپ کے لئے آزمائشیں نہیں پیدا کرتے، نہ ہی آج کل کے ماں باپ بچوں پر بے جا قدغن لگاتے ہیں۔

ساس/ بہو اور نند/ بھاوج کے مثبت تعلقات کا پرچار بہت ضروری ہے۔

میاں/ بیوی کے آپسی تعلقات آج بھی اسی نہج پر ہیں جیسا کہ اللہ نے فرمایا" میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں"

آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے منہ کا نوالہ بھی ضرورتمند کے منہ میں ڈالنے سے گریز نہیں کرتے۔

آج بھی قدم قدم پر انسانیت کا شاہکار لوگ موجود ہیں جو دوسروں کو منہ کے بل گرا کر اپنی منزل تک پہنچنے کی بجائے دوسروں کا سہارا بنتے ہیں۔۔۔

سالی بہنوئی اور دیور بھابی کے خوبصورت رشتے کا تقدس آج بھی اسی طرح موجود ہے۔ اس رشتے پر مان، محبت اور خلوص سے لبریز ڈرامے دکھائے جائیں تاکہ ان رشتوں کی خوبصورتی عیاں ہو نہ کہ لڑکیاں ان رشتوں سے خوف کھائیں؟

آج بھی ایسی بیٹیاں/ بیٹے موجود ہیں جو اپنے ماں/ باپ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کو گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں تو کیوں ساری دنیا کے سامنے ہماری نوجوان نسل کو" باغی" کے روپ میں دکھایا جارہا ہے؟

آج بھی طوائف کے کوٹھے پر ایسی پاکیزہ کہانیاں جنم لیتی ہیں جنہیں تعفن زدہ ماحول اور لغو وبیہودہ الفاظ کی بجائے مثبت انداز میں دکھایا جائے تو یقیناً ایسے ڈراموں کو بھی پذیرائی ملے گی۔۔ آزمائش شرط ہے۔۔کوئی قلم اٹھائے تو سہی۔ ❁

سعیدہ افضل ان دنوں پاکستان کی سینئر ترین صحافیوں میں شُمار ہوتی ہیں۔ ناول نگار۔ افسانہ نویس۔ ان کی اُردو میں بہت چاشنی۔ دل نشینی۔ ہماری درخواست پر وہ اپنی برسوں کی یادیں تازہ کر رہی ہیں۔ آپ میں اور ہم میں بانٹ رہی ہیں۔ گزشتہ ماہ کی قسط فلسطین کے غم کی نذر ہو گئی تھی۔ بہت قارئین نے اس تحریر کو پسند کیا۔ اب پھر 1950 سے رابطہ جڑ گیا ہے۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔

لندن جانے کی تیاریاں زوروں پر تھیں

قسط 13

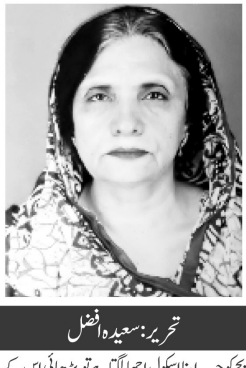

تحریر: سعیدہ افضل

کسی بچے کو جب اپنا اسکول اچھا لگتا ہے تو پڑھائی اس کے لیے بارِ گراں نہیں رہتی۔ مجھے بھی اپنا اسکول اپنے خوابوں کی جنت جیسا لگا تھا۔ کراچی آئے ہوئے ہوائی جہاز میں دعا کرتی رہی۔ اے کاش میں دوبارہ راولپنڈی آؤں پھر سے لال کرتی والے اپنے اسکول میں پڑھوں یہ خواہش میری لیے خواب جیسی ہو گئی تھی۔

بچپن ایک معصوم زمانہ ہوتا ہے تب کچھ چیزیں کچھ خواہشیں خواب جیسی ہو جاتی ہیں۔ میں نے تو لندن دیکھا نہ تھا میرے ذہن میں اس کا تصور موجود ہی نہیں تھا۔ کراچی پہنچی تو گھر میں ہلچل دیکھی اماں تیاریوں میں لگی تھیں' گھر کا سامان سمیٹا جا رہا تھا۔ کچھ ڈبوں میں بند کیا جا رہا تھا۔ جو قیمتی سامان تھا والد صاحب اسے اپنے آبائی گھر ڈیرہ غازی خان دادا کے پاس بھجوانے کا بندوبست کروا رہے تھے۔ اس کام کی تکمیل میں بھی ایک ماہ کا عرصہ درکار تھا۔ اس ہلچل کو دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا تھا۔

جان لیا ہم دور دیس جا رہے ہیں۔ اب دوبارہ ڈیرہ جانا نہ ہو سکے گا مجھے کراچی سے زیادہ اپنے ڈیرہ والے گھر سے لگاؤ تھا جہاں میرے دادا اور دادی جیسی پُر شفقت ہستیاں رہتی تھیں جہاں ہمارے ''کھوہ'' (رقبے) تھے۔ میں وہاں جاتی تھی۔ میری زندگی کے سنہرے دنوں میں ''کھوؤں'' پر جانا سب سے بہترین وقت تھا۔ میں اپنی زندگی کے سارے خوبصورت دنوں کو بھلا سکتی ہوں لیکن بچپن میں کھوہ پر جانا' ہرے بھرے کھیتوں میں سے ہرے چنے کے بوٹے اور گنے توڑنا اور کھلی فضاؤں میں بھاگنا دوڑنا۔ درختوں سے آم اور شہتوت سے دامن بھر لینا۔ چلتے ہوئے رہٹ کی گادی پر بیٹھ کر چکروں کا لطف لینا۔

بیلوں کی جوڑی رہٹ کی گرد چکر کاٹ رہی ہوتی میں گادی پر بیٹھی جھولے لیتی' بیلوں کے گلے میں بجتی گھنٹیوں کے سحر میں کھو جاتی، لکڑی سے بنے گول پہیے جیسے چکرے کے چاروں طرف رسی سے

وقت کا چکر۔ اس کے دو ہی روپ آج اور کل

بندھے مٹی کے بدھنوں کو محویت سے دیکھتی جن سے باری باری ٹھنڈا پانی گرتا اور کھیتوں کو سیراب کرتا۔ برگد کی لمبی مضبوط شاخیں پکڑ کر دیہاتی لڑکیوں کے ساتھ ندی کے پانی میں پاؤں لٹکا کر دیر تک بیٹھے رہنا۔ یہ جنت کے نظارے میں کیسے بھول سکتی تھی۔ یہ میرے زندگی کے خواب تھے اور اب ان کو چھوڑ کر اپنے والدین کے ساتھ اک نئے دیس کو جا رہی تھی۔ شبھی میں اداس تھی تبھی لگا جیسے کسی نے مجھ سے

امی کے ساتھ بغداد میں۔ سعیدہ افضل

دریائے فرات میں کشتی کی سیر۔ امی، سعیدہ افضل

میرے سارے خواب جدا کر دیے ہیں۔

انسان کی زندگی سے اگر اس کے خواب جدا کر دیے جائیں تو زندگی زندگی نہیں رہتی اک بارِ دیگر ہو جاتی ہے۔ خواب اگر کھو جائیں تو جینا کتنا بے معنی اور دشوار ہو جاتا ہے یہ کوئی ان سے پوچھے جو اپنے خوابوں کو کھو بیٹھتے ہیں۔ زندگی میں جب کبھی ایسا وقت آیا بچپن کی انہی یادوں نے میرا ہاتھ تھاما تھا۔ اُجالا کیا اور مجھے جینے کا حوصلہ دیا تھا۔

یادیں انسان کے لیے کتنی بڑی نعمت ہیں۔ اگر اس وقت کی ہوں جب ماضی میں دن اچھے گزرے ہوں۔ مجھے بھی جب سونے سے قبل بے چینی ستائے تو میں ان یادوں کو ذہن میں لا کر دہراتی ہوں یہ لوری کا کام دیتی ہیں اور میں انہی کی نرم گرم بانہوں میں سو جاتی ہوں۔

رات بھر کی پُرسکون نیند کے بعد دوبارہ جاگنا، پھر سے زندہ ہو جانے جیسا ہے، کہا گیا نیند عارضی موت ہے اور بیداری نئی زندگی کی نوید۔ اب میرا آج کل میں ڈھل گیا ہے اور کل پھر سے آج کی صورت میں واپس آ گیا ہے۔ وقت کا چکر ایسا ہی ہے۔ 'آج اور کل' بس اس کے دو ہی روپ ہیں۔

'کل' کی باتیں یاد کرتے کرتے میں سو گئی تھی۔ صبح آنکھ کھلی تو 'آج'

2024 میں 1950 کا احوال لکھنا ہے

میں ہوں۔

آج کی صبح کتنی بھیگی بھیگی ہے، رات بارش ہوئی تھی۔ کراچی کی تو ہر صبح سہانی ہوتی ہے، لگتا ہے آج کا دن بھی خوبصورت ہوگا۔ بہت دنوں سے گرمی پڑ رہی تھی اور اب ساون شروع ہے۔

آج 30 جولائی 2024 منگل کا دن ہے۔ میں نے اپنے کمرے کی بڑی کھڑکی کی دونوں پٹ کھول دیے ہیں۔ برسات سے دھلی ہوئی گیلی گیلی ہوا اندر آنے لگی ہے۔ اس نے میرے وجود میں خوش گواریت کو بھر دیا ہے بس نیند کے ٹوٹنے کا تھوڑا سا خمار باقی ہے۔ کھڑکی کھل جانے سے سامنے کا خوبصورت منظر آنکھوں کو راحت دینے لگا ہے۔ بے شک خالق کائنات نے اس دنیا کو بھی جنت نما بنایا یہ انسان ہی ہے جس نے یہاں بھی گڑبڑ کی ہے اور اب اسے جہنم بنانے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے۔

جہاں میں رہتی ہوں سامنے اور اطراف میں میرے گھر کے اردگرد چھوٹے چھوٹے بنگلہ نما مکانات بنے ہوئے ہیں۔ ہر مکان کے سامنے گرین بیلٹ ہے۔ جہاں قسم قسم کے پھولوں کی پودے آم، جنگلی بادام، نیم و ناریل اور کئی طرح کے درخت سایہ فگن رہتے ہیں۔

دن میں پودوں سے موتیا، چنبیلی، نیاز بو۔ اور رات میں رات کی رانی کی خوشبو آتی ہے۔ میرا گھر اس وقت فور اے 4-A گلشن اقبال میں ہے اور میرے کمرے کی کھڑکی عین اس سرسبز نظارے کے سامنے کھلتی ہے جہاں صبح دم رزق کی تلاش میں آنے والے پرندوں کی چہکاروں سے آنکھ کھل جاتی ہے تو موڈ خوشگوار ہو جاتا ہے۔ نماز فجر کے بعد اخبار والا۔ موٹر بائیک پر اخبار ڈالنے آتا ہے میں اخبار

میرے کمرے کی کھڑکی عین سرسبز نظارے کے سامنے

اٹھانے ٹیرس میں جاتی ہوں۔ منڈیر سے نیچے گلی میں جھانکتی ہوں۔ گلی خاموشی میں ڈوبی ہوئی اسٹریٹ بلب ابھی تک جل رہے ہیں۔ اور پیلی روشنی دے رہے ہیں گلی جیسے سو رہی ہو۔ تب مجھ کو اپنی گلی بھی سہانی لگتی ہے۔

اب تو ساون ہے، تاہم سردیاں ہوں یا گرمیاں صبح بیدار ہوتے ہی میں یہ وسیع و عریض کھڑکی کھول دیا کرتی ہوں جس کے ساتھ میرا بیڈ لگا ہوا ہے۔ مجھے اس جگہ کے سوا کہیں نیند نہیں آتی، لکھنے کا موڈ بھی یہاں ہی بنتا ہے اور میں اپنے بیڈ پر دیوار سے ٹیک لگا کر لکھتی ہوں

میرے والد محمد افضل خان کربلا میں

تبھی پرندوں کی چہکاریں میری روح کے تاروں کو چھیڑ دیتی ہیں۔ یہ سچ ہے ان چہکاروں سے بڑھ کر دنیا کی کوئی دوسری موسیقی خوبصورت نہیں یہ سوتے جاگتے لوگوں کو زندگی کا بھرپور احساس دلاتی ہیں۔ پھر تخیل کے نیلگوں سمندر میں بہالے جاتی ہیں۔

صبح دم اٹھنے کی عادت بڑی نعمت ہے اور پرندوں کی چہکاروں سے لطف اندوز ہونا حیات کی قدرتی شراب کے پینے جیسا ہے یہ زندگی کو تازہ دم بناتا ہے جب ان کی میٹھی میٹھی چہچہاہٹیں کانوں سے روح میں اترتی ہیں تو نیند کا گرانی بھرا خمار ٹوٹنے لگتا ہے۔ دماغ سے بوجھل پن ہٹ جاتا ہے تب جی چاہتا ہے کچھ اچھا سا لکھا جائے مگر صبح

میرا بیٹا مجھے کینیڈا بلانا چاہتا ہے

کی چائے کے بغیر لکھنے کا ماحول نہیں بنتا۔

میری پوتی معصومہ اٹھی ہوتی ہے تو چائے بنا کر تھرماس میں رکھ جاتی ہے۔ سامنے ٹرے میں تھرماس رکھی ہے۔ میں نے قلم اور کاغذ سنبھال لیا ہے۔ آج ''عمر کا سورج'' کے لیے قسط لکھنی ہے۔ 1950 کا احوال، وہ سال جب ہم لندن گئے تھے۔ یادوں کو ترتیب دینے کے لیے، میں بڑے پیار کے ساتھ چائے بھری تھرماس کو تپائی سے اٹھاتی ہوں تبھی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بدن میں کپکپی پیدا کرنے لگتے ہیں۔ بادل بنے ہوئے ہیں۔ شاید ان کے دامن میں کچھ اور بھی بارش کی بوندیں چھپی ہیں۔ مگر یہ کیا۔ یہ تو آگے کو سرکتے جا رہے ہیں میرے دل کے ریکارڈ پر ایک گانا لگا ہوا ہے فلم 'شکست' کا یہ پرانا گیت مجھے بہت پسند ہے۔

کارے بدرا تو نہ جا۔ نہ جا
بیری تو بکس پس نہ۔ جا
گھن نن میں گھم لال۔ سنا
رم جھم رس برسا جا

لکھنے کے لیے برسات سے عمدہ کوئی سرور نہیں ہے۔ یہ بے چینی کے لیے دو آتشہ دارو کی طرح ہے۔ میں نے پیالی بھر لی ہے لیکن بے دھیانی میں بہت سا قہوہ ٹرے میں گرا دیا ہے۔ میری شروع کی عادت ہے جب بھی پیالی کو چائے سے بھرنے لگتی ہوں خیال ہی نہیں رہتا کہ پیالی ختم ہوگئی ہے۔ چائے پیالی میں سما نہیں سکتی تو اس کے کناروں سے گرنے لگتی ہے' ایسے ہی یہ یادیں ہیں جب یادداشت کی گاگر میں سما نہیں پاتیں تو چھلک پڑتی ہیں اِدھر اُدھر بکھرنے لگتی ہیں تب ان کو پھر سے اکٹھا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

یہ بے وجود یادیں۔ یہ گزرتے لمحوں کی پرچھائیاں، یہ بے وجود ہوتے ہوئے بھی طاقت ور ہوتی ہیں کبھی کبھی تو کل کا ماضی آج کے حال کو بھی پچھاڑ ڈالتا ہے مگر یہ وہ موتی نہیں ہیں کہ ان کو تاریخ کے ہار میں پرو کر صندوق میں بند کر کے رکھ دیا جائے یادیں تو آزاد پنچھیوں کی جیسی ہیں۔ کبھی خود بخود سوچ کی ڈالی پر آ کر بیٹھ جاتی ہیں کبھی اڑ جاتی ہیں۔

لکھاری کا اپنا بھی موڈ ہوتا ہے جب تک موڈ نہ بن جائے قلم کاغذ سے دوستی نہیں کرتا، اس کی خاموشی بہت 'دکھ دیار' ہوتی ہے۔ وجود پر ایسی بے چینی مسلط کر دیتی ہے کہ آدمی اس اضطراب اسے چھٹکارا پانے کو ہاتھ پیر مارنے لگتا ہے ٹہل ٹہل کر دل کو مناتا ہے اسے شانت کرنے کی کوشش تڑپ کے درد کو اور بڑھا دیتی ہے۔ روٹھا ہوا قلم تو

کربلا میں ہماری گاڑی ریت کے طوفان میں دھنس گئی تھی

وہ مقام جہاں ہم نے حاضری دی

لکھنے والے کی زندگی اور اس کی سانس کے رشتے کے بیچ کند تلوار کی طرح بن جاتا ہے خدا کرے کسی لکھاری سے اس کا قلم نہ روٹھے۔

لو بارش پھر شروع ہوگئی ہے، لوگ بارش سے لطف لیتے ہیں اور مجھے بارش اور زیادہ بے چین کر دیتی ہے پھر ایک معجزہ ہوتا ہے اور سہانہ موسم دل کے بند دروازے پر دستک دینے لگتا ہے ذہن کے دریچے وا ہو جاتے ہیں۔ لکھنے کی امنگ جاگ پڑتی ہے۔ قلم سے کاغذ کا رشتہ بحال ہو جاتا ہے، سوچوں میں قوس وقزح کے رنگ گھلنے لگتے ہیں روح کا تعلق مردہ دل سے جڑ جاتا ہے اور تخیل الفاظ میں حیات کا امرت گھول دیتا ہے تو صفحات پر حروف پھول بن کر چہکنے مہکنے لگتے ہیں۔

خدا کرے بارش ایسے ہی برستی رہے بے چینی اسی طرح بڑھتی جائے اور میں لکھتی چلی جاؤں مجھے لکھنے کی بہت جلدی ہے اور اسی جلدی کے کارن ٹینشن میں لکھ نہیں پائی۔ اک انجانا خوف رہتا ہے کہ عمر کا سورج تو اب غروب ہونے کو ہے وقت بہت کم رہ گیا ہے اور زندگی کی کہانی کے ابواب بہت سارے ابھی رہتے ہیں، کیا پتہ پوری خودنوشت لکھ پاؤں گی؟ میرا بیٹا حیدر بار بار کہتا ہے، آپ اپنے کاغذات اسکین کر دیں' آپ کو مجھے اپنے پاس بلانا ہے ویزہ اپلائی کرنا ہے۔ وہ میرے لیے کینیڈا کا ویزہ اپلائی کرنا چاہتا ہے اور میں کہتی ہوں۔ ابھی نہیں۔ مجھے ابھی لکھنا ہے۔ اپنی مخصوص جگہ بیٹھ کر۔ وہاں جہاں میرا بیڈ پڑا ہوا ہے۔ کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور میں دیکھ رہی ہوں۔ اس خوبصورت منظر کو جو ہر وقت میری آنکھوں میں سمایا رہتا ہے، دل کو راحت دیتا ہے، یہ منظر مجھے لکھنے پر اکساتا ہے۔ اب بھی میں کھڑکی سے اسے دیکھ رہی ہوں۔ اور لکھ رہی ہوں۔

میرے گھر کے آنگن میں اگے آم، جامن، شریفہ پھل، چیکو اور برگد کا درخت یہ اونچے ہو کر ٹریس کی منڈیروں سے مجھے جھانک رہے ہیں۔ اپنے ہرے ہرے پتوں سے بھری ٹہنیوں کو پھیلائے ہوئے محبت بھری باہوں کی طرح جیسے مجھ کو اپنے پاس بلاتے ہوں۔ (میں اپنے گھر کی اوپر والی منزل میں رہتی ہوں۔)

صبح سویرے جب میں ان کے پاس جا کر ہرے بھرے ملائم پتوں کو پیار سے سہلاتی ہوں تو ان پر بیٹھی چڑیاں پھُر سے اڑ جاتی ہیں۔ یہ پنچھی ان کی کونپلیں کھانے آتے ہیں تو ان پر منڈلاتے پتنگوں کو بھی ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ان کی پھڑ پھڑاہٹ سے بور کے بہت سے پھول آنگن میں گر جاتے ہیں۔

اپنے اپنے موسم میں ہر درخت پر اپنا اپنا الگ بور لگتا ہے اور ہر بور کی اپنی الگ خوشبو ہوتی ہے' آنگن میں بور پر سے گرتے ننھے منے

تینوں پھوپھیاں اور چچا اکبر ہمیں رخصت کرنے آئے تھے

پھولوں کی برسات لگی ہے جن کو کل پھول سے پھل بننا تھا یہ ننھے پنچھی ان کو ضائع کر جاتے ہیں۔ تب میں مٹی کی چھوٹی چھوٹی پراتوں میں پانی اور دانہ بھر کر ٹیرس میں رکھ دیتی ہوں۔ چڑیاں ان کو چگنے آتی ہیں تو ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے میرے دل میں سوئی یادیں جاگ جاتی ہیں۔ اور قلم کاغذ پر بہنے لگتا ہے۔ جب یہ مناظر ہی میرے لیے جنت جیسے ہیں تو پھر میں کینیڈا کیوں جاؤں؟

میں نے ان یادوں کو اب مٹھی میں کر لیا ہے۔ میں ماضی میں لوٹ رہی ہوں دیکھ رہی ہوں، ہمارے گھر میں تینوں پھوپھیاں آئی ہوئی

جون 1950 کا آخر۔ جہاز لندن کے لیے اڑ گیا

ہیں چچا اکبر بھی آئے ہیں۔ یہ سب ہم کو رخصت کرنے آئے ہیں۔ ہمارا بہت سا سامان ملتان کے لیے بذریعہ مال گاڑی بک ہو کر (ڈیرہ غازی خان) چلا گیا ہے اور بہت کم رہ گیا ہے جو پھوپھی دلشاد اور ماموں دانش کے پاس رہے گا۔ جو ان کے استعمال کے لیے ہے۔ یہ 1950 ہے۔

میرے بازو میں کچھ دن پہلے ٹیکا لگا تھا۔ یہ لندن جانے سے پہلے سب کو لگوانا ہوتا تھا۔ ابھی تک بازو پر وہ جگہ دُکھ رہی ہے جہاں ٹیکا لگایا گیا تھا۔ بابا کے پاس نیلا پاسپورٹ ہے اور ہم چار بہنوں کے نام وتفصیل امی کے پاسپورٹ پر درج ہوئے ہیں۔ امی کے پاسپورٹ پر جو تصویر لگی تھی وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی امی کو گزرے ہوئے برس ہو گئے لیکن اب بھی جب میں لمبے جھمکوں والی ان کی یہ تصویر دیکھتی ہوں اسے چومنے لگتی ہوں۔ میری باپردہ ماں نے یہ تصویر جانے کیسے کھنچوائی ہوگی ان کو تو تصویر اتروانے سے بہت حجاب آتا تھا۔

جس دن ہم لندن جا رہے تھے میری منجھلی پھوپھو سردار بیگم (مسز رفیق) ہمارے فریئر روڈ والے گھر خصوصی طور پر کراچی آئی ہوئی تھیں، پھوپھو سردار نے ہمارے جوڑے استری کیے وہ سب سے زیدہ امی کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ عزیزہ اور فہمیدہ دونوں میری چھوٹے بہنوں کو نہلایا۔ انہوں نے عزیزہ کے بال سنوارے ہمیں پوڈر لگایا میرے بالوں کو ربن سے باندھ کر کانوں کے پاس پھول بنا دیے۔ ان دنوں بالوں میں سیدھی مانگ نکال کر پف بنانے کا رواج تھا۔ انہوں نے میرے پف بنائے تھے وہ ہم سے اتنا پیار کرتی تھیں کہ ہمیں رخصت کرتے وقت آبدیدہ ہوگئی تھیں، وہ امی سے گلے ملیں تو رونے لگیں۔

امی سے محبت کرتی تھی ان کی عزت کرتی تھیں کہ ان کی بڑی بھابھی نہیں، ان کی استاد بھی تھیں۔ انہوں نے میری ماں سے قرآن پاک پڑھا تھا اور اُردو کا ابتدائی قاعدہ لکھنا پڑھنا اپنے لڑکپن میں سیکھا تھا۔ وہ میری والدہ سے عمر میں کافی چھوٹی تھیں اور میرے چھوٹے ماموں رفیق کی بیگم تھیں۔ مجھے گود لینے کے تین سال بعد ان کو پہلا بیٹا امتیاز ہوا تھا (جو بعد میں آرمی آفیسر ہوا) اس وجہ سے بھی پھوپھو مجھ سے پیار کرتی تھیں۔

میری دوسری دونوں پھوپھیاں اور دادی دادا بھی ہمارے جانے سے اداس تھے۔ جب ہم کراچی سے لندن جانے کو ایئرپورٹ آئے تو میرے ماموں اور چچا اکبر ہمیں الوداع کرنے ساتھ آئے تھے تب وقت کے ہزاروں پر جہاز اڑ گیا اور میں کھڑکی سے ان پیارے لوگوں کو دیکھنے کی کوشش کرتی رہ گئی ہم لندن کو محو پرواز ہو چکے تھے اور یہ غالباً جون کا آخر تھا۔ (جاری ہے)

کہانی سلمیٰ میر کی

”اطراف ستمبر‘ کے لیے یہ بہت ہی اہم اور حساس تحقیقاتی رپورٹ ہے۔ ڈاکٹر اختر حمید خان کا ایک انتہائی قابل قدر ادارہ ’اورنگی پائلٹ پروجیکٹ‘ برباد ہوگیا ہے۔ اس کی کہانی سلمیٰ میر کی زبانی سنئے۔ ’اطراف‘ کی متعلقہ حکام اور اداروں سے درخواست ہے کہ وہ اس نیک نام ادارے کو برباد کرنے والوں کے خلاف تحقیقات کریں۔ متعلقہ مصدقہ دستاویزات ’اطراف‘ نے حاصل کرلی ہیں۔“

30 سال سے انسانیت کی خدمت میں مصروف سلمیٰ میر

اطراف تحقیقی رپورٹ

1988 میں اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے دفتر واقع سیکٹر 10 دولت ہاؤس سے اپنی ملازمت کا آغاز کرنے والی سلمیٰ میر جنہوں نے 30 سال اس ادارہ کے ساتھ کام کیا۔ اور یہ بھی اس بات پر فخر محسوس کرتی ہیں کہ ان کی ملازمت کی شروعات ڈاکٹر اختر حمید خان جیسی شخصیت کے زیرِ سایہ ہوئی۔ یہ بات کرتے ہوئے سلمیٰ کے چہرے پر ایک رونق آگئی تھی جب انہوں نے بتانا شروع کیا کہ اس وقت اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کا دفتر اورنگی ٹاؤن میں ایک اینٹوں کے بھٹے کی

میڈم پروین کے قتل کے بعد سب زیادہ متحرک ہوئے

بالائی منزل پر تھا۔ اس منزل کا نام دولت ہاؤس تھا۔ غریبوں کے محلہ میں کیا شاندار نام تھا جہاں ڈاکٹر اختر حمید اپنی سوچ کی دولت بانٹا کرتے تھے۔ میرا گھر یہاں سے بہت نزدیک تھا۔ حال ہی میں میں نے جامعہ کراچی سے اسلامی تاریخ میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ملازمت کی تلاش تھی۔ سو میں نے بھی اوپی پی کا رخ کیا۔ جہاں شعبہء صحت میں سوشل آرگنائزر کے عہدہ سے ملازمت شروع ہوجاتی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ میری فیلڈ بالکل الگ تھی۔ سماجی کام کیا ہوتے ہیں؟ کس طرح کام کیا جاتا ہے؟ مجھے اس کی الف ب بھی نہیں معلوم تھی۔ تنخواہ 1200 روپے ماہانہ طے پائی تھی۔ جو میری پہلی ملازمت کے طور پر انتہائی مناسب تنخواہ تھی۔ کیونکہ یہاں مجھے معاوضہ کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ ملنے والا تھا یعنی کام کا ہرگز تجربہ نہ تھا۔ سکھانے کے لیے ڈاکٹر صاحب جیسی عظیم شخصیت بذات خود موجود تھی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر شمیم زین العابدین، پروین رحمٰن، انور راشد جیسے منجھے ہوئے ساتھیوں کی ٹیم موجود تھی۔ ان سب نے مل کر ایک بہترین وسازگار ماحول فراہم کیا تھا جس نے نہ صرف سیکھنے بلکہ کام کرنے کے عمل کو بھی آسان بنا دیا تھا۔ اوپی پی کا یہ ماحول میرے لیے ایک بہترین درسگاہ کے طور پر سامنے آیا۔ میرے سیکھنے کے مواقع کچھ اس طرح رہے۔

شعبہ ہیلتھ جسے خاصدا کا نام دیا گیا۔ اس میں رہتے ہوئے کمیونٹی میں جانا۔ محلہ کی سطح پر ماؤں کے ساتھ میٹنگ کی

افراد کی نااہلی اور لالچ ادارے کو لے ڈوبا

جاتیں اور صحتِ عامہ کی پیغام رسائی ہوتی۔ 1992 میں اوپی پی نے اپنا ذاتی دفتر قصبہ کالونی میں قائم کیا۔ اس دفتر کی شاندار عمارت معروف آرکیٹیکٹ اور ہم سب کے رہنما سرعارف حسن نے ڈیزائن کی ہے۔ جو اس کی خوبصورتی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ 1993 میں مجھے ریسرچ سیکشن میں بھیج دیا گیا۔ اس کے ڈائریکٹر جناب انور راشد تھے۔ سروے، اس کے نتائج اور رپورٹ پر کام کرنے کے علاوہ میں دو کتابچے لکھنے میں کامیاب ہوئی۔ پہلا صحت کی بنیادی تعلیم دوسرا ویکسینیشن مینوئیل۔ اس کے علاوہ شعبہ اشاعت میں انگریزی سے اردو تراجم بھی کیے۔ ٹراسکرپشن، پروفائل اور لیکچرز کو تحریری شکل دی۔ 1995 میں ایجوکیشن پروگرام شروع کیا گیا اس میں پروین رحمٰن صاحبہ جو اوپی پی۔ آر ٹی آئی کی ڈائریکٹر تھیں انہوں نے مجھے ایجوکیشن پروگرام کا حصہ بنالیا۔

2001 میں مجھے ایجوکیشن پروگرم منیجر بنایا گیا 2018 تک میں نے اسی حیثیت سے کام کیا۔

2013۔۔۔ سب سے بڑا سانحہ! میڈم پروین کے قتل کے بعد جس طرح بھی حالات رہے ہم سب اپنی اپنی جگہ کام کرتے رہے۔ لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ہم سب میڈم کے لیے دکھی تھے۔ ان کا ہنستا کھلکھلاتا چہرہ کسی بھی طرح نہیں بھولتا۔ ہم غیر متوقع بات کے لیے تیار رہتے لیکن

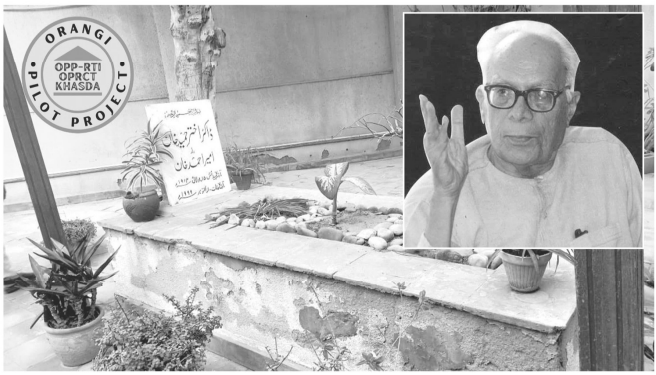

اس کے باوجود ہمارے کام کرنے کی لگن میں شدت آگئی تھی ۔پہلے ہم نوکری کرتے تھے لیکن اب میڈم سے وابستگی کا اظہار اپنے کام کے ذریعہ دینا چاہتے تھے۔حفاظتی اقدامات کے پیشِ نظر 2014 سے 2016 تک اربن ریسورس سینٹر کی عمارت واقع شاہراہ فیصل سے کام کو جاری رکھا گیا۔

2016 میں او پی پی قصبہ کالونی دفتر میں واپس آئے ۔مگر یہاں آکر ایسا محسوس ہوا کہ او پی پی کے اندر ہی حالات سازگار نہیں ۔ہم پرانے ملازمین پر زمین تنگ کرنے کی

او پی پی آر ٹی آئی سے سینئرز کو نکالا گیا

کوشش کی جارہی ہے ۔سلیم علیم الدین جو جوائنٹ ڈائریکٹر تھے انہیں میڈم کی جگہ ڈائریکٹر بنادیا گیا۔لیکن وہ کسی بھی طرح اس عہدے کے اہل نہیں تھے ۔پروین رحمٰن صاحبہ جس صلاحیت ، قابلیت اور محنت سے کام کرتی تھیں ۔سلیم علیم الدین ان کے برعکس تھے۔اور شاید پروین رحمٰن کے بعد اورنگی پائلٹ پروجیکٹ ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کی تباہی کے ایک بڑے ذمہ دار بھی یہی ہیں ۔

سلیم علیم الدین کی نااہلی سے پروین رحمٰن کی بڑی بہن عقیلہ اسمٰعیل کے ذریعہ ادارہ پر باآسانی قابض ہونے کا موقع مل گیا۔عقیلہ اسمٰعیل اوران کی بیٹی سحر اسمٰعیل کے ذریعہ ریسرچ ٹریننگ اینڈ انسٹی ٹیوٹ کے فنڈز پر اپنا کنٹرول حاصل کیا۔امتیاز صاحب جو RTI کے ڈائریکٹر بہت ایماندار اور شریف انسان تھے ۔ان کو نااہل ثابت کرنے پر تلی رہیں ۔

ڈاکٹر اختر حمید پروٹوکول کے جتنے خلاف تھے عقیلہ اسماعیل اس کی عادی

2016 میں اس شریف النفس آدمی کے ساتھ انتہائی تضحیک آمیز رویہ رکھا ۔سب کے سامنے ڈانٹ ڈپٹ کی ۔وہ ذیابطیس اور فشارِ خون جیسے عارضہ میں مبتلا ہوئے ۔ساتھ ہی ذہنی دباؤ کا روگ بھی لگ گیا۔جس کے نتیجہ میں گردے فیل ہوئے بالآخر ڈائیلیسس کے مریض قرار پائے لیکن یہ دکھ ان کی جان ہی لیکر گیا۔عقیلہ اسمٰعیل تو پہلے سے تیار بیٹھی تھیں اب انہوں نے اپنی مرضی کے بندے سیدثاقب اشفاق کو فنانس ڈائریکٹر بنادیا۔

2016 کے آخر اور 2017 کے شروع میں بورڈ میں گنتی کے ہم خیال ممبران کی موجودگی میں عقیلہ اسمٰعیل کو چیئرمین او پی پی ۔آر ٹی آئی بنادیا گیا۔اس دن ایسا محسوس ہوا جیسے کہ پروین رحمٰن کو پھر قتل کردیا گیا ہو۔یہ واضح طور پر ادارہ کی بربادی کا

نشان تھا۔ساتھ ہی انہوں نے سحر اسمٰعیل کو آل پروگرام ڈائریکٹر بنا دیا۔اس پورے منظر نامہ میں سلیم علیم الدین ایک کٹھ پتلی معلوم ہوئے۔جنہیں استعمال کیا جاتا رہا۔

حالات کی اس تبدیلی کو ہم سب نے پہلے ہی بھانپنا شروع کر دیا تھا۔آر ٹی آئی کے ملازمین اشرف ساگر اور جاوید علی

اساتذہ ٹریننگ کے لیے او پی پی آئیں۔لیکن مجھے ان سے ملنے کی اجازت نہ دی گئی۔تربیت سے لیکر سرٹیفکیٹ کے اجراء تک مجھے دور رکھا گیا اور تمام تر کریڈٹ سحر کو دیدیا۔انہوں نے اس موقع پر بہت کھلے ہاتھ سے پیسے لٹائے تاکہ سحر کے نام پر ایک شاندار پروگرام ہو۔اساتذہ کو

ڈاکٹر اختر حمید کا اورنگی پائلٹ پروجیکٹ اب وہ نہیں رہا

نے عقیلہ اسمٰعیل اور سحر اسمٰعیل کی انٹری میں سہولت کاری کی۔ اور آج تک کر رہے ہیں۔شاید اسی لیے آج تک ان کی نوکریاں باقی ہیں ورنہ کئی تو اپنے گھر جا چکے ہیں۔

عقیلہ اسمٰعیل اور ان کی بیٹی سحر اسمٰعیل کو سوائے انگریزی بولنے کے کچھ بھی نہیں آتا۔کمیونٹی میں کام کا کوئی تجربہ نہیں۔لیکن اس کے باوجود وہ ہمیں بے مقصد کمیونٹی میں دوڑاتیں اور ہم جاتے۔آخر وہ ہمیں بھی کب تک برداشت کرتیں۔انہیں اپنی بیٹی کے لیے میدان تو خالی کرنا ہی تھا جہاں اس کے آگے کوئی تجربہ کار اور سینیئر نہ ہو۔جب انہوں نے ہم سب کے عہدوں میں اکھاڑ پچھاڑ شروع کی یعنی لائبریرین کو فیلڈ ورک دیدیا۔اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ کو فوٹو کاپی کرنے پر لگا دیا

کھانا اور سفری اخراجات بھی دیئے گئے جو سراسر ڈاکٹر صاحب یا میڈم پروین کے اصولوں کے خلاف تھے۔پھر مجھ پر بہت خفا ہوئیں کہ میں نے اس قدر فضول خرچی کی جبکہ مجھے تو پروگرام سے دور ہی رکھا تھا۔اسی بات کو جواز بنا کر انہوں نے ایجوکیشن پروگرام ہی بند کر دیا۔پروگرام تو خیر بند ہی کرنا تھا۔ان کا اصل مقصد تو سحر کی مارکیٹ کرنا تھی جس میں وہ کامیاب ہوئیں۔ظاہر ہے اب میرے لیے کوئی کام نہ تھا۔نہ میں فیلڈ پر جا سکتی تھی اور نہ ہی دفتر میں کوئی کام تھا۔ہم سینیئر زلوگوں سے گاڑیاں بھی واپس لے لی گئیں جو ہماری پک اینڈ ڈراپ اور فیلڈ کے لیے ہوتی تھیں۔ہمارے کمرہ میں جونیئر اسٹاف کو لا بٹھایا اور ہمارے ساتھ توہین آمیز رویہ

رکھتے ہوئے مجھے اور میری ساتھی رعنا کو کینٹین میں بیٹھنے پر مجبور کیا۔وہ ہمیں آہستہ آہستہ کنارے لگا رہی تھیں۔بالآخر انہوں نے ایک دن حکم نامہ جاری کیا کہ چونکہ ہمارے لیے کوئی کام نہیں لہٰذا ہم اپنی ملازمت سے استعفیٰ دیدیں اور یہ کام آج ہی پانچ بجے سے پہلے پہلے لکھ کر دیں۔ہم نے انور راشد کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا تو وہاں بھی ہمارے لیے کچھ نہ تھا۔وہ خود بے بس معلوم ہوئے اور اس سفاکی نے مزید دو گھروں کا چولہا ہانڈی بند کر دیا۔

حالیہ او پی پی

حالیہ او پی پی عقیلہ اسمٰعیل کے شکنجہ میں ہے۔آر ٹی آئی کے

۔ہمیں بھی اپنے سروں پر تلوار لٹکتی نظر آنے لگی اور یوں لسٹ میں ہمارا بھی نام آ گیا۔

او پی پی۔آر ٹی آئی سے سب کو نکالے جانے کی وجہ الگ الگ ضرور ہے لیکن ان سب میں ایک بات تو مشترک تھی کہ سینیئرز کو کسی بھی طرح یہاں سے نکالنا ہے۔تاکہ سحر کو کسی سے مسئلہ نہ ہو۔دوسرے لفظوں میں سحر کا ناشائستہ رویہ،این جی اوز سے متعلق لاعلمی کو کوئی چیلنج نہ کر سکے۔ہم اپنی نوکری کو بچانے کے لیے ہر ٹاسک کو پورا کرتے لیکن اس وقت بہت شدت سے احساس ہوا جب کمیونٹی میں موجود اساتذہ کی تربیت کے لیے ہم نے 100 اساتذہ کا ہدف مکمل کیا۔85

علاوہ اب او سی ٹی پر بھی مکمل کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ابھی دسمبر 2023 میں وہاں سے سینیئر اسٹاف میں حسن زہرہ،نائلہ غیاث اور ثمینہ نعیم کو جبری طور پر ریٹائرمنٹ دیدی گئی ہے۔موجودہ اسٹاف میں اب صرف وہی لوگ شامل ہیں جو ہر وقت ان ماں بیٹی کی خوشامد کریں اور آتے جاتے سلوٹ ماریں۔گاڑی کا دروازہ کھولیں۔ڈاکٹر اختر حمید کبھی کسی کو اپنا ذاتی یا دفتری سامان اٹھانے نہیں دیتے تھے وہ اس پروٹوکول کے سخت خلاف تھے۔اب کمیونٹی سے رشتہ ختم ہوا۔گورنمنٹ کے ساتھ بیٹھ کر جس طرح منصوبہ سازی ہوا کرتی تھیں اب وہ باتیں قصہ پارینہ بن چکی ہیں۔ورنہ تو یہ وہی او پی پی ہے کہ جہاں ورلڈ بنک کے نمائندے اس کا کام دیکھنے آتے۔ سابقہ وزیر خزانہ سرتاج عزیز،سابقہ وزراء اعظم شہباز شریف اور عمران خان بھی اس پروجیکٹ کو دیکھنے آئے تھے۔

عقیلہ اسمٰعیل چیئر پرسن کی صاحب زادی سحر اسمٰعیل ماہانہ سات لاکھ روپے تنخواہ کے طور پر وصول کر رہی ہے۔وہ بھی کبھی کبھار آنے کے۔اس کے علاوہ ثاقب اشفاق فنانس ڈائریکٹر آر ٹی آئی،شارق،شاہنواز اور دیگر بھاری تنخواہیں اور بھرپور مراعات وصول کر رہے ہیں۔جبکہ اختر حمید صاحب،پروین رحمٰن اور امتیاز صاحب کم تنخواہ اور زیادہ کام کی زندہ مثالیں ہیں۔عمر کے جس حصے میں ہم پرانے ملازمین کو نکالا ہے۔ہم ایسے میں کہاں دوسری جگہ ملازمت کریں گے۔ہم نے تو کچھ سوچا بھی نہ تھا۔ہم سب کی تربیت ہوتی گئی اور ہم سب ہی اپنی اپنی جگہ ادارے کے لیے اہم ہوتے گئے۔مگر یہ سب تو خاک ہوا۔میری طرح بہت لوگ ہیں جو اِدھر اُدھر پریشان ہیں۔

بہرحال اگر ایک جملہ میں کہا جائے تو اورنگی پائلٹ پروجیکٹ اب وہ نہیں رہا جو اس کا خاصہ تھا۔ڈاکٹر اختر حمید خان کا او پی پی نظریہ لوگوں کو سماجی اور تکنیکی رہنمائی اور مالی معاونت دیکر انسانی بقاء اور اس کی ترقی پر کام کرنا تھا اب وہاں ڈاکٹر صاحب کی صرف قبر موجود ہے۔جہاں ڈاکٹر صاحب کا نظریہ اور کام بھی دفن ہو گیا۔

میری زندگی کی پہلی نوکری جو 30 سال کے عرصہ پر محیط رہی ۔باوجود اس کے کہ اس زمانے میں ذہن کی پختگی نہ تھی مگر ان تمام رہنماؤں نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اپنے حصہ کا کچھ کام کر جاؤں۔جواب میرے پاس نہیں ہے وہ نہیں ہے لیکن یہ میری خوش قسمتی ہی رہی جس نے میری سوچ کی راہیں ہموار کیں۔مجھے ایک نئی دنیا سے متعارف کروایا۔ بدنصیب میں نہیں۔بدنصیب یہ لوگ ہیں۔ان کے گھرانے کا حصہ ہوتے ہوئے بھی ان کے ذہن تاریک رہے۔ڈاکٹر اختر حمید کا وجود انہیں کھٹکتا ہے۔بجا ہے کہ توفیق ہر کسی کے نصیب میں کہاں۔ ❁

”پاکستان کے سینئر ترین اور بہت بے باک۔ بے خوف صحافی اور دانشور حسین نقی سے ڈاکٹر سید جعفر احمد کی گفتگو میں پاکستان کی تاریخ ایک نئے انداز سے سامنے آرہی ہے۔ صحافت کی۔ انسانی حقوق کی۔ اور آزادی اظہار کی۔ قارئین اسے بہت توجہ سے پڑھ رہے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اپنے خیالات کا اظہار بھی کریں۔“

سالانہ فنکشن میں ناچ گانے پر جمعیت کو بہت اعتراضات تھے

پاکستان کے سینئر ترین صحافی۔ شہری آزادیوں کی جدوجہد کے سرکردہ رہنما حسین نقی سے ڈاکٹر سید جعفر احمد کی خصوصی گفتگو

تیسری قسط

ہنگامے کراچی کے

سوال: لاہور سے پھر آپ کراچی آگئے!!

جواب: میرے والد اکثر مجھے وہاں انڈیا بلاتے بھی تھے مگر میں نہیں گیا۔

سوال: آپ لاہور سے یہاں آگئے تو کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لیا؟

جواب: اُس وقت کراچی یونیورسٹی شفٹ ہو رہی تھی اور میرا یہی پلان تھا کہ پولیٹیکل سائنس یا اکنامکس کا مضمون منتخب کرتا۔ ہم نے پولیٹیکل سائنس کا انتخاب کیا، پھر ہمارا داخلہ الیاس صاحب نے پولیٹکل سائنس میں کردیا تھا۔ منظور الدین صاحب بھی وہاں پڑھاتے تھے۔ اور ایک صاحب تھے جو علیگڑھ سے آئے تھے اور جس کتاب سے وہ نقل کر کے لیکچر دیتے تھے وہ کتاب ہم نے برٹش کونسل سے نکال لی۔ ایک لڑکا وہ کتاب سامنے کی سیٹ پر کھول کر بیٹھ جاتا تھا۔ ہمارے لیے اُس وقت ایک مضمون اسلامک پولیٹیکل

میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی مہم کے باوجود یونین کا الیکشن جیت گیا

تھاٹ کے نام سے کورس میں شامل کردیا گیا تھا۔ پہلے آئین کا مضمون بھی پڑھایا جاتا تھا مگر ایوب خان نے اعتراض کیا کہ آئین تو میں نے دیا ہی نہیں اور یونیورسٹیوں میں آئین پڑھایا جارہا ہے لہٰذا اسے ختم کیا جائے، جس کی جگہ کوئی دوسرا مضمون پڑھایا جائے۔ چنانچہ الیاس صاحب نے پھر اسلامک پولیٹکل تھاٹ کا مضمون نکالا۔ الیاس صاحب پولیٹیکل سائنس کے ہیڈ تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر امیر حسن صدیقی صاحب، جو جمعیت الفلاح سے تھے ان کو یہ مضمون پڑھانے کو کہا۔ وہ روز انہ صرف خلافتِ حضرت عمرؓ پڑھاتے تھے۔

یونیورسٹی میں کافی لڑکے لڑکیوں کے ’افیئرز‘ کا مجھے علم تھا

سوال: عقیلہ کیانی ابھی نہیں آئی تھیں؟

جواب: نہیں۔ ابھی وہ نہیں آئی تھیں۔

سوال: یعنی اب آپ پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کرنے لگے؟

جواب: جی۔ یہ ۱۹۶۱ء۔ ۱۹۶۰ء کا زمانہ تھا۔

سوال: طلبہ یونین کا الیکشن کب ہوا، جس کے دوران یا جس کے بعد آپ طلبہ سیاست میں نمایاں ہوئے اور اسٹوڈنٹ لیڈر بنے؟

جواب: الیکشن ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ میرا ۶۳ء۔ ۱۹۶۲ء کا سیشن تھا۔ وائس چانسلر صاحب نے طالبعلموں کی یونین کی صدارت کے لیے الیکشن لڑنے کی یہ شرط رکھ دی گئی تھی کہ ایم اے سال اول پاس کیا ہو۔ حالانکہ سال اول اور فائنل الگ الگ تھے۔ چار چار پیپرز دو سالوں میں کرنے ہوتے تھے۔ اس طرح ایک سال مجھے الیکشن نہیں لڑنے دیا کیونکہ جب ہم شہر بدری کے خاتمے پر واپس آئے تو امتحانات ہو چکے تھے۔ پھر ۶۲ء۔ ۱۹۶۱ء میں ہم نے ایم اے سال اول پاس کرلیا اور الیکشن لڑنے کے اہل ہو گئے۔ ہمارے مقابلے میں مکرم علی خان شیروانی تھے جو بعد میں نیشنل کالج میں پولیٹیکل سائنس کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ بھی ہوئے۔ وہ جمعیت میں تھے۔ ہم ساتھ پڑھتے تھے اور ساتھ ہی کیمپین بھی کرتے تھے۔ میری ان سے کافی اچھی دوستی تھی۔ سائنس اور آرٹس فیکلٹی سے تین تین نمائندے یونین کے لیے منتخب ہوتے تھے، انیس احمد آرٹس فیکلٹی

سے منتخب ہوئے تھے۔ ان کا تعلق جمعیت سے تھا۔ جمعیت کا دوسرا نمائندہ سائنس فیکلٹی سے الیکٹ ہوا تھا۔ انیس جمعیت سے تھے جہاں ان کا رتبہ بڑا تھا اور میں ہر بات میں ان سے مشورہ کرلیتا تھا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ کوئی اختلاف نہ ہو اور یونین کا سیشن مناسب طریقے سے چلے۔ میں نے انیس سے طے کیا تھا جو بھی فیصلہ لیں گے

حفیظ جالندھری شاہنامہ اسلام پڑھ رہے تھے۔ وہ ہوٹنگ سے ناراض ہو کر جانے لگے

مل کر لیں گے۔ سالانہ فنکشن میں ناچ گانے پر جمعیت کو بہت اعتراضات تھے۔ میری کینٹ میں ڈاکٹر فیروز احمد بھی شامل تھے جو سائنس فیکلٹی سے تھے۔ میں نے فیروز کو کلچرل

کراچی پریس کلب میں ایئر مارشل اصغر خان کی آمد کے موقع پر سینئر صحافیوں اور کراچی یونین آف جرنلسٹس کے عہدیداروں کے ساتھ گروپ

پراگراموں کا انچارج بنایا اور کہا جتنے بھی پیسے چاہیں یونین کے لیے فنڈ سے لے لیں۔ میں نے انیس کو بھی یہی کہا۔ اس وقت اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ فرید صاحب ہمارے treasurer ہوا کرتے تھے۔ پہلے یونین کا ایک منتخب وائس پریذیڈنٹ ہوا کرتا تھا مگر جب یونین کا آئین بنایا گیا تو اس کے تحت پریذیڈنٹ کا عہدہ بنایا گیا۔ پہلے پریذیڈنٹ کوئی ٹیچر ہوا کرتا تھا لیکن اب اسٹوڈنٹ ہونے لگا۔

سوال: آپ پہلے پریذیڈنٹ ہوئے؟

جواب: نہیں۔ مجھ سے پہلے یونین کے پریذیڈنٹ فتیاب علی خان تھے۔ اس سے پہلے مارشل لا لگنے کے بعد یونین کا آئین بن گیا تھا۔ ایوب خان نے یونینز ختم نہیں کی تھیں۔ لاہور کی پنجاب یونیورسٹی میں بھی یونین تھی۔ غالباً بارک اللہ وہاں کے پریذیڈنٹ منتخب ہوئے جو جماعت کے تھے۔

سوال: ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سے اختلافات کب ہوئے؟

جواب: ڈاکٹر قریشی نہیں چاہتے تھے کہ میں الیکٹ ہوجاؤں۔ انہوں نے پہلے بہت کمپین کی۔ انہوں نے اسلامک اسٹڈیز کی لڑکیوں کو بلا کر کہا کہ حسین نقی شیعہ کمیونسٹ ہے۔ یونیورسٹی ۱۹۶۰ء میں جب شفٹ ہوئی تو کافی لڑکیاں فائنل ایئر میں آگئی تھیں۔ یہ زیادہ تر پنجابی سوداگران دہلی کے خاندانوں سے تھیں۔ ان کے والدین کہتے تھے کہ اب ہم یونیورسٹی کیمپس میں نہیں بھیجیں گے کیونکہ وہ بہت سنسان جگہ تھی اور ٹرانسپورٹ کا مسئلہ تھا۔ ہم نے بہت سے والدین کو ان کے گھر جا کر یقین دہانی کرائی تھی کہ لڑکیوں کا تحفظ ہماری ذمہ داری ہے بہت عرصہ بعد جب میں نے 'دی نیوز' میں لڑکیوں کو رکھا تو ان کے والدین نے کہا نائٹ ڈیوٹی یہ نہیں

بلوچ لڑکوں کا 'رسٹی گیشن' میرے رسٹی گیشن کے بدلے میں ختم کیا گیا

کرسکتیں تو میں نے کہا کہ یہ میری ذمہ داری ہوگی، گارڈز لے بھی آئیں گے اور چھوڑ بھی جائیں گے۔ نیوز میں آدھی تعداد لڑکیوں کی تھی۔ اس سے پہلے ہر ادارے میں محض ایک لیڈی رپورٹر ہوتی تھی یا کبھی کبھی کوئی ایک آدھ ایڈیٹوریل سیکشن میں آجاتی تھی۔

اشتیاق صاحب نے خود بھی کمپین کیا۔ ان لڑکیوں نے آ کر مجھ سے کہا کہ نقی بھائی ہم نے سنا ہے آپ کمیونسٹ ہیں۔ ویسے بھی بہت اسٹوڈنٹ شیعہ تھے۔ میں نے کہا دونوں میں سے ایک چیز ہوسکتی ہے یا تو شیعہ یا کمیونسٹ۔ ان بچوں کو تو اتنا معلوم نہیں تھا کہ کمیونسٹ کیا ہے لیکن یہ منفی تاثر لازماً دیا جاتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ نماز نہیں پڑھتے، اللہ کو نہیں مانتے؟ تو میں نے کہا کیا آپ کو ایسا محسوس ہوا ہے کہ میں نہیں مانتا تو وہ کہنے لگیں نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں یونیورسٹی میں کافی لڑکیوں کا ایڈوائزر تھا۔ سب کے افیئرز کا مجھے علم ہوتا تھا۔ یعنی میں ساری یونیورسٹی میں لڑکیوں کا بھائی تھا۔ میں سب لڑکوں کو سختی سے کہتا تھا کہ افیئر ہوگا تو شادی بھی ضرور کرنی پڑے گی۔ جہاں لگتا تھا کہ لڑکا فراڈ ہے وہاں ہم قصہ ختم کروا دیتے تھے۔ ہم سختی سے اسٹوڈنٹس کو سمجھاتے تھے کہ امتحان سے تین مہینے قبل گھومنا پھرنا بند کردیں۔ بہرحال بہت زیادہ لڑکیاں تو ہماری سپورٹر تھیں۔ میں اشتیاق صاحب کی کمپین کے باوجود الیکشن جیت گیا۔ جوائنٹ سیکریٹری کے الیکشن میں کچھ اختلاف پیدا ہوگیا تو اشتیاق صاحب نے کہا سارا الیکشن دوبارہ ہوگا۔ میں نے ان سے جا کر کہا کہ میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ آپ مجھے ہرا نہیں سکتے اور اب بھی میں ہی الیکٹ ہوں گا۔ وہ کافی غصہ بھی ہوئے اور ناراض رہے۔ مجھے یاد ہے کہ دوسری بار الیکشن میں، میں تیرہ ووٹ سے جیتا جبکہ باقر عسکری کا کہنا تھا کہ تین چار ووٹ سے جیتے ہو۔ فتیاب گنتی پر میری طرف سے بیٹھے۔ بالآخر نتیجہ میرے حق میں نکلا۔ لیکن یہ ضرور ہوا تھا کہ قریشی صاحب کی کمپین سے کچھ ووٹ

ضرور کم ہوئے تھے۔
حفیظ جالندھری سے متعلق ایک واقعہ یاد آرہا ہے کہ سالانہ فنکشن میں انیس احمد وغیرہ نے کہا کہ اسٹوڈنٹس ویک کے پروگرام میں پہلے ان سے 'شاہنامۂ اسلام' پڑھوایا جائے۔ہم نے کہا ٹھیک ہے۔حفیظ صاحب اُس زمانے میں یہاں کراچی آئے ہوئے تھے۔مشفق خواجہ کے چھوٹے بھائی رحمن کہنے لگے،نقی بھائی سب کچھ ہوسکتا ہے مگر یونیورسٹی میں یہ نہیں ہوسکتا۔ہم نے وعدہ کرلیا تھا لہٰذا حفیظ جالندھری کو بلوایا گیا۔تقریب میں ، میں نے صدارت کی۔حفیظ جالندھری نے جیسے ہی 'شاہنامۂ اسلام' پڑھنا شروع کیا تو پہلے کسی نے چوہے کی پھر بلی وغیرہ کی آوازیں نکالنا شروع کیں۔حفیظ صاحب میری جانب مڑے اور کہا جنابِ صدر یہاں کچھ کمیونسٹ گھس آئے ہیں۔پورا ہال نقی بھائی نقی بھائی ! چلّا رہا تھا۔وہ ناراض ہوکر تقریب چھوڑ کر چلے گئے کہ میں نہیں پڑھتا۔

بہر حال میں ان کے پیچھے گیا اور معذرت کی۔عبدالحمید چھاپڑا اور ایک لڑکا جو بہت ہوٹنگ کرتے تھے ان سے میں نے طے کرکے ایک مرتبہ پروگرام کے دوران ہال سے نکال دیا تھا تاکہ باقی لڑکے پھر ہوشیار ہوجائیں۔لڑکوں نے سمجھ لیا کہ چھاپڑا جو میرے بہت قریب تھا میں اسے نکال سکتا ہوں تو کسی کو بھی نکال سکتا ہوں۔
قریشی صاحب کے ساتھ اختلاف یوں ہوا کہ تین بلوچ لڑکے جو بلوچستان اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے تھے انہوں نے سب الیکشنز میں این ایس ایف کو بھی کافی سپورٹ کیا تھا، اور میری ان سے اچھی دوستی بھی ہوگئی تھی۔طاہر محمد خان، چنگیز (خاران سے تھا اور کراچی یونیورسٹی کی فٹ بال ٹیم کا کپتان بھی تھا) اور ایک ابراہیم تھا جو بعد میں وہاں بلوچستان کے فیملی پلاننگ محکمے میں ڈائریکٹر بنا۔ان تینوں کو رسٹیکیٹ کردیا گیا تھا کیونکہ ان کا ایک کرسچن لڑکے سے جس کا تعلق پنجاب سے تھا، جھگڑا ہوگیا تھا۔ہم نے اُن کے اختلافات ختم کروادیے،اور آپس میں وہ گلے بھی مل لیے۔ہم قریشی صاحب کے پاس گئے اور ہم نے کہا کہ یہ معاملہ تو حل ہوچکا ہے آپ اُس لڑکے سے پوچھ سکتے ہیں، سب لوگوں نے آپس میں صلح کرلی ہے۔میں نے ان سے کہا کہ یہ لڑکے جن کو بلوچستان حکومت سے ڈھائی سو روپے وظیفہ ملتا ہے یہ کہاں سے خود پڑھیں گے۔ان کا کیریئر تباہ ہوجائے گا اور ان کو سرکاری ملازمت بھی نہیں ملے گی، لہٰذا یہ آرڈر منسوخ کردیں۔قریشی صاحب نے مجھے آفر کی کہ اُن کا رسٹی کیشن ختم کردوں اور آپ کو رسٹی کیٹ کردوں؟ تو میں نے کہا جی بالکل کردیں۔فوراً میرے دماغ نے یہی فیصلہ کیا اور اس طرح میرا رسٹی کیشن ہوگیا۔
سوال: رسٹی کیٹ ہونے کے بعد آپ کی کیا منزل بنی؟
جواب: ہم کافی ہاؤس میں بیٹھتے تھے جہاں ضیاء الحسن موسوی صاحب بھی آتے تھے۔موسوی صاحب انفارمیشن میں ہوا کرتے تھے۔وہاں ایک روز میں بیٹھا تھا کہ سجاد باقر صاحب وہاں آئے میں نے ان کو اپنا قصہ سنایا اور کہا کہ کل میں سید محمد تقی صاحب (اُس وقت جنگ کے ایڈیٹر) کے پاس جاؤں گا کہ 'جنگ' میں کچھ جاب کرلوں۔تقی صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے طالبعلموں کی تحریک پر مضمون لکھوایا تھا 'جنگ' کے لیے۔میں نے ان سے پیسے مانگے تو وہ کہنے لگے 'جنگ' میں لکھنا ہی بڑی بات ہے۔میں نے کہا کہ آپ نے مجھ سے مضمون لکھوایا ہے لہٰذا اب مجھے پیسے دیں۔وہاں کے اکاؤنٹنٹ اطہر نفیس جو شاعر بھی تھے، نے ایک پرچی بنادی اور مجھے اس طرح مضمون کے تیس روپے ملے۔
میں سجاد باقر صاحب کو بتا رہا تھا کہ ان کو میں نے بتایا میں 'جنگ' کے لیے کام کروں گا۔انہوں نے کہا تم وہاں کیوں جارہے ہو۔میں نے کہا ملازمت کی غرض سے۔یہ بات کراچی کے کافی ہاؤس کی ہے جب میں یونیورسٹی سے رسٹی کیٹ ہوا تھا۔میں نے قریشی صاحب کو یہ یقین دہانی کروادی تھی کہ کوئی ہڑتال وغیرہ نہیں کرواؤں گا نہ ہی امتحانات ملتوی ہوں گے کیونکہ یہاں وہ لڑکے پڑھتے ہیں جن کے والد کلرک اور چپڑاسی ہیں، ایک سو تیس روپے اُن کی کُل تنخواہ ہے اور تیس پینتیس روپے صرف آنے جانے کا خرچہ ہے۔میں اس طرح وہاں سے چلا آیا۔باقر صاحب نے مجھے کہا کہ اردو میں کوئی صحافت وغیرہ نہیں ہوتی تم انگریزی میں کرو۔موسوی صاحب بھی وہیں بیٹھے تھے انہوں نے کہا کہ تم کل اسلم علی کے پاس چلے جاؤ،انہوں نے ہمارے یہاں سے چھٹی لے لی ہے اور وہ آج کل پی پی آئی کے ڈائریکٹر ہوچکے ہیں۔میں اگلی صبح پی پی آئی کے دفتر میں چلا گیا۔جاوید بخاری صاحب اُس وقت وہاں کے منیجر ہوتے تھے۔اسلم علی مجھ سے کہنے لگے تم لیڈر ٹائپ آدمی ہو،رسٹی کیٹ بھی ہوئے ہو اور اسٹوڈنٹ لیڈر بھی رہ چکے ہو،تم تو یہاں بھی فساد کروگے۔تم جاوید صاحب سے مل لو۔میں انگریزی میں تحریریں، تقریریں، پریس ریلیز وغیرہ لکھتا رہتا تھا۔میں نے جاوید صاحب کو یقین دہانی کروائی کہ میں اب اسٹوڈنٹ لیڈر نہیں ہوں اور میں جس کام کو شروع کرلوں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہوں لہٰذا آپ جس کام کا کہیں گے وہ میں کروں گا۔انہوں نے کہا کل سے آجانا۔میں نے کہا میں آج سے ہی شروع کرلیتا ہوں کیونکہ مجھے اُس وقت ملازمت کی ضرورت بھی تھی۔اُن کے پاس خبروں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔پی پی آئی کئی بین الاقوامی نیوز ایجنسیز سے خبریں مانیٹر کرلیتی تھی۔ان میں کافی garbage بھی ہوتا تھا۔میں نے سب کی غلطیاں درست کیں اور دن رات محنت سے خود کو اہل ثابت کردیا۔میں ان کے یہاں پہلا ایسا شاگرد تھا جسے پورا مہینہ بھی نہیں ہوا اور پندرہ دن کام کرنے کے بدلے پورے مہینے کی تنخواہ مل گئی

معظم علی صاحب نے میری شادی کے کارڈ بھی چھپوائے

۔میں نے ان سے کہا کہ میرے پاس تو سونے کے لیے بھی جگہ نہیں ہے، میں رات بھی یہیں رک جاؤں گا۔میں کام کرتے کرتے وہیں میز پر سوجاتا تھا اور اٹھتے ہی کام شروع کردیتا تھا۔معظم صاحب دیکھتے تھے کہ کام وغیرہ ٹھیک سے ہورہا ہے اور مجھے میز پر سوتا دیکھ کر انہوں نے کہا تم میرے کمرے میں کاؤچ پر سوجایا کرو،انہوں نے میرے صبح کے ناشتے کے لیے روزانہ کے بن، مکھن اور چائے بھی لگوادی۔جب مہینہ ختم ہوا تو مجھے ڈیڑھ سو روپے ملے۔
ایک اور قصہ، ایک روز حمید احمد خان صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم نے یہ جو کام شروع کیا ہے یہ اچھا کام نہیں ہے،تم ایم اے کرو، میں تمہارا رسٹیکیشن ختم کروادوں گا۔وہ مجھے اشتیاق حسین قریشی کے پاس لے گئے، ان سے مجھے ملوایا اور کہا کہ میرے دوست حسین نقی کو تو آپ جانتے ہوں گے۔انہوں نے ہاں میں سرہلادیا۔
حمید احمد خان صاحب یہاں آتے رہتے تھے اور میں اُن کا اٹینڈنٹ ہوا کرتا تھا، ممتاز حسن صاحب جو اس وقت نیشنل بینک کے سربراہ اور ادیب بھی تھے، ان کے گھر وہ ٹھہرتے تھے اور ان کی گاڑی مجھے لے جاتی تھی جہاں بھی انہیں جانا ہوتا تھا میں ان کے ساتھ جاتا تھا۔انہوں نے مجھے بتایا کہ ظفر علی خان صاحب ان کے بڑے بھائی تھے، مگر ان کی مائیں علیحدہ تھیں۔انہوں نے مجھے پوچھا کہا اختر علی خان صاحب کو تو تم جانتے ہوگے وہ مولانا ظفر کے بیٹے تھے۔ان کے لیے پورا کونڈا دہی، ربڑی اور گلاس میں دودھ، گھی میں تلے ہوئے پراٹھے آتے تھے، جبکہ میں اور میرا بھائی جو دوسری

ماں سے تھے، ہمارے لیے چائے اور رات کی باسی روٹی آتی تھی، یہ تھے تمہارے جید صحافی مولانا ظفر علی خان۔ اختر علی خان، حمید صاحب کے ہم عمر تھے۔ بہرحال وہ صحافت کو پسند نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ میں واپس یونیورسٹی میں پڑھوں، اور پھر پڑھاؤں۔ مگر میں نہیں گیا۔

سوال: آپ کے ساتھ گھر میں کون کون رہتا ہے؟

جواب: ہمارے ساتھ ہمارے بیٹے اصغر رہتے ہیں۔ ایک اور گھر بھی ہے۔ ہماری بیگم، قزلباش خاندان سے تھیں۔ لاہور کے علاقہ نواب صاحب میں ان کی زمینیں تھیں۔ یہ ساری زمینیں قزلباش خاندان کی تھیں۔ ڈاکٹر مبشر نے مجھے کہا کہ تمہاری بیگم کی زمینیں لے نہ لی جائیں تو مجھے کاغذات دکھاؤ اور جلد ہی ہاؤسنگ سوسائٹی رجسٹر کروالو۔ انہوں نے جعفر ٹاؤن کے نام سے اس کو رجسٹر کروایا۔ ہماری ساس کو ان کی ساس نے جو زمینیں دی تھیں یہ وہی زمینیں تھیں۔ ہماری ساس قزلباش نہیں تھیں، وہ لکھنؤ سے تعلق رکھتی تھیں، انہوں نے یہ زمین بیٹیوں کو دے دی۔ جعفر ٹاؤن کا سارا کام میری بیگم ہی نے سنبھالا۔ بلکہ کبھی اس بارے میں چھپا بھی تھا کہ وہ پاکستان کی واحد ٹاؤن ڈویلپر ہیں جنہوں نے technically ٹھیک ٹاؤن بنایا ہے۔ نیر علی دادا کو جب معلوم ہوا تو اُس نے کہا کہ نقشہ میں بناؤں گا (وہ بہت دُبلے پتلے تھے اس لیے لوگوں نے ان کے نام میں 'دادا' لگا دیا۔ نیر نے پھر اسے اپنے نام کا حصہ بنا لیا)۔

سوال: یحییٰ خان کے زمانے میں یہ جو قزلباش تھے، وزیر خزانہ مظفر علی قزلباش، اُن سے بھی کوئی تعلق تھا، آپ کا یا فیملی کا؟

جواب: وہ ہماری بیگم کی دادی کے چھوٹے بھائی تھے، جو دوسری ماں سے تھے۔ ہماری بیگم کی جو دادی تھیں وہ خود قزلباش تھیں۔ ان کے دادا افغانستان سے پاکستان آئے تھے اور دادی ان کے ہمراہ تھیں۔ مظفر صاحب کی والدہ لکھنؤ کی تھیں۔

سوال: مظفر علی خان قزلباش کا تو تعلق پنجاب سے تھا!

جواب: جی، وہ پنجابی تھے، لیکن ان کی والدہ لکھنؤ کی تھیں۔ ان کے والد سَر فتح علی خان (جن کو سَر کا خطاب ملا) جو شیعہ کالج لکھنؤ کے اسپانسرز میں بھی تھے، ان کی کئی بیویاں تھیں۔ پہلی تو قزلباش تھیں جن سے ہماری بیگم کی دادی تھیں، یہ ان کے سوتیلے بھائی تھے۔ مظفر علی

جلائے جانے والا قرآن نہیں تھا۔ کیش رجسٹر تھا

خان تقسیم کے وقت اپنے تمام ننھیال کو یہاں لاہور لے آئے تھے۔ یہ جو لاہور ریلوے اسٹیشن ہے یہ بھی قزلباشوں کی زمین تھی اور ریلوے ہیڈ کوارٹرز کی زمین قزلباش ٹرسٹ ہی کی زمین ہے۔ پی ٹی وی تک اسی ٹرسٹ کے گھر تھے۔ مظفر صاحب یہیں رہے اور ۱۴ اگست کو مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ پہلے یونینسٹ پارٹی میں بھی وہ

وزیر تھے۔ ایک بھائی ان کے فوج میں گئے۔

وادیٔ صحافت کی آبلہ پائی

سوال: بہت شکریہ، آپ نے تفصیل سے خاندانی پس منظر بیان کیا۔ میں جاننا چاہوں گا کہ آپ کا صحافت کا سفر کس طرح شروع ہوا؟

صدر ایوب نے کہا کہ تم نے کوئی بھونڈا سوال کرنا ہے کرلو

جواب: وہ کراچی ہی سے شروع ہوا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں جب میں کراچی یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹ یونین کا صدر تھا، یونیورسٹی سے رسٹی کیشن کے بعد میں نے سجاد باقر رضوی صاحب کے کہنے پر پی پی آئی جوائن کی، ورنہ میرا 'جنگ' میں جانے کا ارادہ تھا۔ شروع ہی سے میری یہ خواہش تھی۔ میری ایک اور خواہش یہ تھی کہ میں مرچنٹ نیوی میں چلا جاؤں جس کے لیے ٹیسٹ بھی دیا تھا۔ انگریزی کا امتحان تو میں نے اچھے نمبروں سے پاس کرلیا مگر ریاضی مجھے نہیں آتی تھی، تو میں پاس نہیں ہوا۔

جرمن نیوز ایجنسی ڈی پی اے نے، پی پی اے کو ٹیلی پرنٹرز وغیرہ دیے اور کہا کہ آپ اس کو پی پی آئی (پاکستان پریس انٹرنیشنل) بنالیں۔ معظم علی صاحب کے بارے میں بڑا مشہور ہوا کہ وہ امریکہ اور سی آئی اے کے قریب ہیں۔ انہوں نے بہرحال یہ ایجنسی قائم کی کیونکہ ان کو اے پی پی کا ہیڈ نہیں بنایا گیا تھا تو انہوں نے ایک حریف (rival) ایجنسی قائم کی۔ ہمیں جاوید بخاری صاحب نے ملازمت پر رکھ لیا۔ اے کے سومار نے اس میں کچھ انویسٹمنٹ کردی، وہ ایوب خان سے قریب تھے۔ معظم علی صاحب نے ان کو پی پی آئی کا چیئرمین بنالیا۔ اس وقت میں کراچی یونین آف جرنلسٹس کی ایگزیکٹیو کا بھی ممبر تھا۔ 'انجام' اخبار کو جسے اس کے مالک سے لے کر پریس ٹرسٹ میں شامل کیا گیا تھا، اُس وقت گورنمنٹ بند کر رہی تھی۔ ابراہیم جلیس صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ ایک ہڑتال میں پی یو جے نے کہا کہ اسے کیوں بند کر رہے ہیں۔؟

سوال: یہ کس موقع پر اخبار بند کیا جارہا تھا؟

جواب: اس وقت ملک بھر میں مختلف ٹریڈ یونینز ہڑتال کر رہی تھیں۔ پی ایف یو جے نے 'انجام' کی پابندی کے خلاف تحریک شروع کی۔ اس تحریک میں کراچی یونین آف جرنلسٹس پیش پیش تھی۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دونوں جگہ اس کے حق میں ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ مختلف شہروں سے انجام کی ہڑتال میں شامل ہونے کے لیے یونینز کے نمائندے آئے، ان میں مقبول بٹ بھی شامل تھے۔ یہ وہی مقبول بٹ تھے جن کو ہندوستان میں کشمیر لبریشن فرنٹ کے رہنما کی حیثیت سے پھانسی کی سزا ہوئی اور جیل میں ہی ان کی قبر بھی بنادی گئی۔

اے کے سومار نے میرے متعلق معظم علی صاحب سے کہا، کہ میں نے سنا ہے یہ آپ کا امپلائی ہے۔ معظم صاحب نے کہا، 'ہاں' مگر یہ نکالا نہیں جاسکتا، یہ تو یونین کا لیڈر ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ اس کا تبادلہ کردو۔ انہوں نے میرا سبّی میں تبادلہ کروادیا۔ سبّی میں کچھ بھی نہیں تھا اور مجھے بیورو چیف بنادیا گیا۔ میں نے کہا کہ کسی بڑے شہر میں مجھے بھیج دیں تو میرا حیدرآباد تبادلہ کروادیا گیا۔ میں حیدرآباد میں رہا، مسرور حسن خان صاحب وہاں کمشنر تھے۔ ایوب خان شکار کھیلنے آتے تھے۔ اے پی پی، پی پی آئی، 'پاکستان ٹائمز' اور 'عبرت' (سندھی اخبار) کے ہم چار نمائندے تھے۔ صرف یہی ایئرپورٹ جاتے تھے۔ باقی سب ایوب خان سے سوال کرتے ہوئے گھبراتے تھے کہ وہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر رہ چکے تھے۔ اُس وقت ایوب خان کا آئین بن چکا تھا اور وہ صدارت کے منصب پر فائز ہوچکے تھے۔ صدر تو وہ ۱۹۶۰ء میں ریفرنڈم کے ذریعے بھی بن گئے تھے مگر اب اپنے خود ساختہ آئین کے اجراء کے بعد وہ آئینی صدر بن گئے تھے۔ اس بار جب وہ آئے تو مجھ سے کہنے لگے کہ تم نے کوئی

بھونڈا (Awkward) سوال کرنا ہے تو کرلو۔ وہ خوش مزاج آدمی تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کے لیے خان صاحب نے تیتر بٹیر وغیرہ کماد کے کھیتوں میں پہنچا دیے ہیں جو آپ کے انتظار میں ہیں کہ آپ اُن کا شکار کریں۔ وہ کہنے لگے، تم پھر بھی سوال کرلو۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ بڑے زور شور سے کہہ رہے ہیں کہ جنہوں نے کوآپریٹوز کے پیسے کھائے ہوئے ہیں اور واپس نہیں کیے اُن سے ہر طور وصول کروں گا تو کیا آپ اپنے دوستوں سے بھی وصول کریں گے؟ وہ کہنے لگے کہ ضرور کروں گا۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیا سب سے قریبی دوست سے بھی کریں گے؟ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ بتاؤ کون سب سے قریبی دوست ہے میرا؟ میں نے اُن کے اصرار پر کہا کہ حسن محمود۔ پھر وہ کہنے لگے اچھا، میں اب شکار پر جا رہا ہوں۔ حسن محمود سب سے بڑے ڈیفالٹر تھے جو بہاولپور کے تھے۔ کمشنر مسرور حسن خان صاحب نے واپس آکر معظم علی صاحب کو فون کیا۔ معظم صاحب نے پھر مجھے فون کیا کہ، یہ تم نے کیا کیا؟ خان صاحب کہہ رہے ہیں کہ اس لڑکے کا یہاں رہنا میرے لیے ٹھیک نہیں ہے، یہ تو میری نوکری لے جائے گا۔ پھر میں نے کہا کہ آپ میرا تبادلہ کراچی کروادیں۔ وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ اُس وقت تک 'انجام' کا معاملہ بھی طے ہو چکا تھا۔

معظم صاحب پیسے کم دیتے تھے مگر خوش اخلاق بہت تھے۔ انہوں

نے ۱۹۶۶ء میں میری شادی کے کارڈ بھی بنوائے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ پھر مجھے آپ لاہور میں ٹرانسفر کردیں۔ وہاں بشیر قریشی صاحب تھے جو جماعت سے بہت قریب تھے۔ وہ ایف سی کالج میں انگریزی کے ٹیچر بھی تھے۔ ہم جب بھی لاہور ڈیبیٹ کے لیے جاتے تھے تو وہ اکثر ججز میں ہوا کرتے تھے۔ تو وہ اس طرح ہمیں پہچانتے بھی تھے۔ میں نے معظم صاحب سے کہا کہ میرا سسرال بھی وہیں ہے، اس طرح مجھے آسانی رہے گی تو معظم صاحب اس پر راضی ہوگئے کہ مجھے لاہور بھیج دیا جائے۔ لاہور میں قریشی صاحب نے مجھے چیف رپورٹر بنالیا۔ صلاح الدین حیدر جو ایک نامور جرنلسٹ رہے ہیں، وہ وہاں تھے تو ان کی اور قریشی صاحب کی بالکل بنتی نہیں تھی۔ ان کے ساتھ یہاں ۱۹۶۳ء میں ہم نے کام بھی کیا ہوا تھا تو ہم ایک دوسرے کے دوست تھے۔ وہاں میں نے چیف رپورٹر کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۷۰ء میں صحافیوں کی ملک گیر ہڑتال کی قیادت منہاج برنا صاحب اور کے جی مصطفی صاحب نے کی، اس میں شریک ہونے والوں میں، میں بھی شامل

پی پی آئی میں دن بھر کام کرتا رات کو معظم علی صاحب کے صوفے پر سوجاتا

تھا۔ اس سے کچھ وقت قبل ۱۹۷۰ء میں ہی قرآن پاک جلنے کا اشتعال انگیز پروپیگنڈا ہوا تھا۔ ہمارا پی پی آئی کا ایک رپورٹر محمد اصغر تھا جو بعد میں 'پاکستان ٹائمز' چلا گیا تھا۔ میں نے اُس کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ جو بھی جلوس نکلیں تم ان کے ساتھ رہا کرو۔ اُس روز مولانا بھاشانی صاحب ڈھاکہ سے آئے اور بھٹو صاحب بھی اسی دن لاہور سے آئے، ان کا ایک مشترکہ جلوس نکلا جو مال روڈ پر آیا۔ بھاشانی صاحب کا جلوس نیلا گنبد پہنچا، جو پاک ٹی ہاؤس کے پاس ہے۔ وہاں جماعت اسلامی کا دفتر اور سرکاری نیشنل سینٹر تھا۔ جماعت اسلامی کا دفتر اوپر کی منزل پر تھا۔ وہاں نعرے بازی ہو رہی تھی اور اس گروہ میں سے کچھ لوگ اوپر چڑھ گئے۔ وہاں یہ بات مشہور ہوئی کہ بھاشانی کے جلوس کے شرکاء نے آگ لگا دی اور اس میں قرآن جل گیا۔ محمد اصغر وہاں پہنچے۔ انہوں نے جماعت کے کارکنوں سے پوچھا کہ قرآن کہاں ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ وہ اوپر مچان پر رکھا ہوا ہے۔ اصغر نے میز پر کرسی رکھی اور اوپر چڑھ کر مبینہ طور پر جو قرآن تھا وہ اتار لیا۔ جب وہ کھولا تو وہ کیش رجسٹر تھا۔ محمد اصغر نے دفتر آکر بتایا کہ 'آگ ضرور لگی تھی مگر وہ قرآن نہیں تھا بلکہ کیش رجسٹر تھا، میں نے خود کھول کر دیکھا ہے'۔ اصغر نے مجھے بتایا کہ باہر تو یہ نعرے لگ رہے تھے کہ چینی چوہوں اور روسی کتوں نے قرآن جلا دیا۔ نیچے سڑک پر نعرے اسلامی جمعیت طلبہ کی طرف سے لگتے تھے۔ میں نے اصغر سے کہا کہ رپورٹ بناؤ۔ اُسی وقت جمعیت کے لڑکے بھی ہمارے دفتر جو کچھ فاصلے پر تھا وہاں آگئے اور کہنے لگے کہ وہ قرآن ہی تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ بھی اپنی رپورٹ بنادو، ہم نے اصغر کی اور جمعیت والی دونوں خبریں ریلیز کردیں۔ ایک میں یہ تھا کہ قرآن جل گیا جبکہ دوسری میں تھا کہ وہ قرآن نہیں تھا بلکہ کیش رجسٹر تھا۔ اُس وقت پیپلز پارٹی کافی فعال تھی۔ ملک معراج خالد صاحب پنجاب کی پیپلز پارٹی کے لیڈر تھے، بعد میں وہ چیف منسٹر بھی بنے تھے۔ ڈاکٹر مبشر لاہور کے صدر تھے، شیخ رشید پارٹی کے مرکزی وائس چیئرپرسن تھے اور پنجاب کے غالباً اُس وقت وہ صدر تھے۔ انہوں نے فوراً اشتہار چھپوائے کہ وہ قرآن نہیں بلکہ کیش رجسٹر تھا۔ لاؤڈ اسپیکر سے بھی یہ اعلان کیا۔ بھٹو صاحب نے پارٹی لیڈروں سے کہا کہ آپ لوگ اس کے لیے کل جلوس نکالنا۔ جس میں سب لیڈر ایک ٹرک پر جلوس کے ساتھ قرآن لے کر نکلے تھے۔ پچھلے روز جمعیت کے لڑکوں نے ہمارے دفتر کو ransack کر دیا تھا۔ اُسی زمانے میں ٹی وی شروع ہوا تھا۔ جاپانیوں نے میڈیا کے دفاتر کو ٹی وی سیٹ دیے تھے، ہمارے دفتر میں بھی ایک دیا تھا۔ جمعیت کے لڑکوں نے اس کے تار کاٹ دیے اور ٹیلیفون کے تار بھی کاٹ دیے۔

سوال: معظم علی صاحب تو خود جماعت اسلامی کے سپورٹر تھے!

جواب: ہاں۔ معظم صاحب ہر ایک کے سپورٹر تھے جو پی پی آئی میں انویسٹمنٹ کرے۔ اس قصے کے چند روز بعد معظم صاحب نے مجھ سے کہا کہ تمہارے خلاف پانچ ہزار پوسٹ کارڈ آئے ہیں جن میں مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ تمہیں نکالا جائے۔ میں نے کہا کہ میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں، رپورٹ بھی محمد اصغر کی دی ہوئی تھی مگر پھر بھی میری ملازمت ختم کردی گئی۔ جب انگریزی روزنامہ 'دی سن' نکلا تو میں نے اسے جوائن کرلیا۔ آئی ایچ برنی صاحب کا 'آؤٹ لُک' نکلتا تھا اس میں، میں کالم لکھتا تھا۔ مشرقی پاکستان کے ہفت روزہ 'ہالیڈے' کے لیے بھی میں لکھتا تھا۔ ان سب کے لیے لکھتا تھا تو کچھ نہ کچھ گزارہ ہو جاتا تھا۔ پھر محمد ادریس جو 'پاکستان ٹائمز' میں ہوتے تھے ان کا 'ڈیٹ لائن انٹرنیشنل' کے نام سے ریڈیو پر پروگرام آتا تھا جس کے لیے مواد کی تیاری میں اور زِم (ظفر اقبال مرزا) کیا کرتے تھے۔ ہمیں چھ سو روپیہ ماہانہ شیئر میں مل جایا کرتے تھے یعنی تین تین سو روپے دونوں کو ملتے تھے۔ ظفر اقبال مرزا (مرحوم) بعد میں لاہور میں 'پاکستان ٹائمز' اور 'ڈان' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ یہ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اواخر کی بات ہے۔ طاہر مرزا صاحب بھی اس کے ایڈیٹر رہے جن کا بعد میں کینسر سے انتقال ہوگیا تھا۔ زِم (ZIM) پہلے نیوز ایڈیٹر تھا۔ اگر کوئی چھٹی پر چلا جائے، زِم کو مسئلہ ہو مثلاً بیماری وغیرہ تو میں بغیر ملازمت، بغیر تنخواہ سارا کام دیکھ لیتا تھا۔ رپورٹوں کی

ایڈیٹنگ کا کام بھی میں کرتا رہا۔
نثار عثمانی صاحب کے کمرے میں سیاسی لیڈروں جیسے ملک قاسم، معراج خالد وغیرہ کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ نیچے ہارون موٹرز کا شوروم تھا اور اوپر کا سارا حصہ 'ڈان' کا دفتر۔ عثمانی صاحب بھی پیچھے 'ڈان' کی ایک عمارت میں رہتے تھے جہاں بعد میں 'ویو پوائنٹ' کا دفتر تھا۔ نور خان صاحب نے اُس وقت اردو کا ایک اخبار نکالنے کا سوچا تھا اور نکالا بھی تھا، وہ نام مجھے یاد نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ 'آزاد' میں بھی ان کا کچھ انویسٹمنٹ تھا۔ 'آزاد' کا کام وہیں ہوتا تھا۔ جو لوگ ۱۹۷۰ء کی ہڑتال میں نکالے گئے تھے، ان میں کافی جرنلسٹ مثلاً آئی اے رحمن، حمید اختر اور عبداللہ ملک وغیرہ شامل تھے۔ انہوں نے کچھ پیسے جمع کرکے 'آزاد' نکالا تھا۔ 'آزاد' کا ڈیکلیریشن جن صاحب کے پاس تھا ان کے والد نیشنلسٹ تھے اور وہ اہلِ حدیث کے بڑے لیڈروں میں سے تھے۔ ان کے بیٹے کے پاس 'آزاد' کا ڈیکلیریشن تھا۔ وہ معذور تھے تو وہ یہ ڈیکلیریشن کرائے پر دیتے تھے جن سے ہم نے بھی کرائے پر لے لیا۔ پہلی قسط کے پانچ ہزار روپے میں نے ان کو دیے۔

'پنجاب پنچ'، مشرقی پاکستان کا بحران، اور ہمارا اعتاب

اسی زمانے میں، میں نے دو اخبار اور بھی نکالے۔ صفدر میر صاحب نے ایک دن کہا کہ ایک ویکلی اخبار نکلے گا ۱۹۷۰ء میں۔ تم اس کے ایڈیٹر ہوگے (اُس وقت میں بے روزگار بھی تھا)۔ میں نے کہا میں تو رپورٹر آدمی ہوں، میں نے ایڈیٹنگ کا کام کبھی نہیں کیا، تو وہ کہنے لگے کہ تم ہی کروگے۔ اب پتا چلا کہ کوئی پیشکار تھے ہائی کورٹ میں، انہوں نے اپنے بیٹے کے نام پر ایک ڈیکلیریشن لیا 'پنجاب ٹائمز' کے نام سے۔ بعد میں، میں نے جو اخبار نکالا وہ 'پنجاب پنچ' تھا۔ مال روڈ پر ہارشو بلڈنگ میں ایک طرف پریس کلب تھا۔ جب پی یو جے revive ہوئی تھی تو وہاں ایسوسی ایٹڈ پریس کا ایک دفتر تھا جس میں خالد بھائی، ایک بڑے جرنلسٹ اس کے انچارج تھے۔ وہ اپنا دفتر یہاں سے ختم کررہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ نقی یہ دفتر اوقاف کا ہے اور تمہارے صفدر میر سے بہت اچھے تعلقات ہیں تو یہ تم لوگوں کے نام ٹرانسفر ہوسکتا ہے، تم اس پر ابھی قبضہ کرلو، میں اپنا آفس بند کررہا ہوں ورنہ کوئی فوراً ہی لے لے گا۔ مسعود بھگوان (مسعود کھدر پوش) کے میر صاحب سے اچھے تعلقات تھے۔ اُس وقت وہ اوقاف کے سربراہ تھے۔ میں نے صفدر میر صاحب سے کہا کہ اس پر ہم نے قبضہ کرلیا ہے اور آپ کی ذمہ داری ہے کہ مسعود صاحب سے بات کریں۔ شام میں انہوں نے مسعود صاحب سے بات کی تو انہوں نے اُسی وقت وہ دفتر پی یو جے کے نام الاٹ کردیا (میں نے کہا تھا میرے نام پر مت کیجیے گا) اس کے ہی سامنے 'پنجاب ٹائمز' کا دفتر تھا۔ اب ۱۹۷۰ کی الیکشن کمپین کا زمانہ تھا۔ یہ بڑے سینیئر جرنلسٹ

'انجام' پر پابندی کے خلاف ہڑتال میں مقبول بٹ بھی شامل تھے

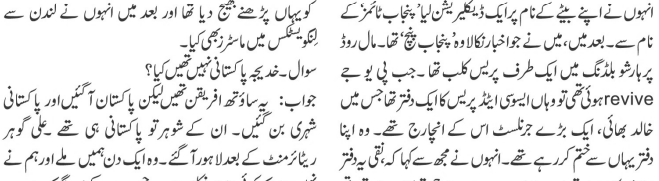

تھے۔ میں نے صفدر میر صاحب کو کہا کہ دیکھیے ہم جو پالیسی بنائیں گے وہ تنقیدی ہوگی سب کے لیے۔ وہ یک طرفہ نہیں ہوگی۔ شیخ مجیب اور بھٹو دونوں ہی نمائندے ہیں ان میں جو بھی اچھا کام کرے گا اس کا ذکر بھی ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ یہ پالیسی ٹھیک ہے لیکن یہاں پرچہ نکلنا چاہیے پروگریسو نقطہ نظر سے اور اس کے ایڈیٹر بھی تم ہوگے۔ پھر ہم اس کے ایڈیٹر بن گئے۔ زِم اور خدیجہ بھی تھے، خدیجہ گوہر کے شوہر علی گوہر، میجر اسحق کے دوست تھے اور یحییٰ خان کے بھانجے بھی تھے۔ علی گوہر لندن میں پاکستان کے ملٹری اتاشی تھے، اور خدیجہ کینیرڈ میں پڑھتی تھیں۔ میجر علی گوہر کی بہن خدیجہ کی کلاس فیلو

تھیں۔ اس بہن نے کہا کہ تم میرے بھائی سے شادی کرلو، وہ بہت اسمارٹ اور خوبصورت آدمی تھے۔ ساؤتھ افریقہ میں خدیجہ کے والد کا کاروبار تھا، وہاں صرف لڑکوں کے کالج تھے تو اس لیے خدیجہ کو یہاں پڑھنے بھیج دیا تھا اور بعد میں انہوں نے لندن سے لنگوئیسٹکس میں ماسٹرز بھی کیا۔
سوال۔ خدیجہ پاکستانی نہیں تھیں کیا؟
جواب: یہ ساؤتھ افریقن تھیں لیکن پاکستان آگئیں اور پاکستانی شہری بن گئیں۔ ان کے شوہر تو پاکستانی ہی تھے۔ علی گوہر ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور آگئے۔ وہ ایک دن ہمیں ملے اور ہم نے انہیں بتایا کہ کوئی اخبار نکلنے والا ہے، جس پر وہ کہنے لگے کہ، ارے خدیجہ سے میری جان چھڑواؤ اس کو بھی ساتھ رکھ لو۔ میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں۔ وہ کہنے لگے مجھے ایک زمین الاٹ ہوگئی ہے جو سب فوجیوں کو ہوتی تھی تو خدیجہ کہتی ہے کہ تم کاشتکاری کرو۔ میں مرغیاں وغیرہ لے کر چلا جاتا ہوں تو وہ پکا دیتی ہے، میں اپنے جوتوں اور کپڑوں پر مٹی وغیرہ ڈال کر آجاتا تھا کیونکہ مجھ سے کاشتکاری نہیں ہوتی، لہٰذا اس کو کسی طرح انگیج کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ پیسوں کی تو اُن کے پاس کمی نہیں تھی۔ خدیجہ کے والد نے کینٹ میں پورے ایک ایکڑ زمین خرید کردے دی تھی۔ اس طرح ہمارے ساتھ خدیجہ کو بھی رکھ لیا گیا۔ زِم 'پاکستان ٹائمز' کے ساتھ ساتھ 'پنجاب ٹائمز' میں بھی کام کرتے تھے۔ جب ہم ملازمت سے نکالے گئے تھے تو مسعود اللہ خان بھی ساتھ تھے۔ ان کو بھی ہمارے ساتھ رکھ لیا گیا۔ نجم حسین سید سے بھی ہمارے تعلقات بن گئے تھے۔ ان کو میں نے کہا کہ انگریزی میں پنجابی زبان کے اوپر مضمون لکھیں۔ پھر انہوں نے ایک سیریل لکھا جو ہمارے یہاں چھپا اور بعد میں کتاب کی صورت میں بھی شایع ہوا۔
سوال: اچھا یہ جو اعظم سہروردی صاحب کا 'پنجاب ٹائمز' نکلا اس میں سرمایہ کاری کس نے کی تھی؟
جواب: فنانسر تو اعظم کے اپنے تھے۔ لیکن جب اخبار نکل آیا اور الیکشن کمپین شروع ہوا تو نسیم اکبر خان نے اسے خرید لیا۔ وہ جنرل اکبر خان کی بیوی اور بیگم شاہ نواز کی بیٹی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ اخبار بھٹو کے خلاف لکھ رہا ہے، تو انہوں نے پیشکار کے بیٹے کو یہ آفر کردی کہ مجھے یہ بیچ دو، اعظم سہروردی نے ہماری تین مہینے تک کی تنخواہیں نہیں دی ہوئی تھیں۔ تین مہینے سے ہم سب ہی کام کررہے تھے جس میں خدیجہ، زِم بھی تھے، یہ سب میری ذمہ داری تھے کیونکہ ان کو میں نے ہی رکھا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ یہ اخبار بک گیا ہے۔ ہمارا تو بیگم نسیم اکبر خان سے کوئی تعلق نہیں تھا تو ہم نے کہا کہ ہمارے پیسے دے دو تو ہم دفتر چھوڑ دیں گے۔ اُس نے کہا تم ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہو تم جاؤ؟ ہم نے دفتر کا تالا بند کیا اور ہم پی یو جے کے آفس گئے جس کو اب میں نے پریس کلب بھی بنالیا تھا۔
ہم نے میر صاحب کو فون کیا کہ یہ اس طرح کررہے ہیں اور ہمارے پیسے نہیں دے رہے، آپ یہاں آجائیں۔ یہ کہتا ہے کہ ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں جب ہوں گے تب دے دیں گے۔ وہ اپنا بریف کیس لیے ہوئے تھا اور کہہ رہا تھا میں تو جارہا ہوں، اتنے میں میر صاحب آگئے۔ میں نے اعظم کو کہا تم ایسے نہیں جاسکتے اور اس کو ایک زوردار راپٹا مارا۔ میر صاحب نے دیکھ لیا اور کہنے لگے 'he deserved it" یہ پیسے دیے بغیر نہیں جاسکتا۔ اُس کا نام اعظم سہروردی تھا۔ بعد میں اُس نے وکالت پاس کی اور وکیل بن گیا۔ اُس نے بھی بعد میں کہا کہ "yes, I deserved it"۔ بعد میں اُس سے میری دوستی ہوگئی تھی کیونکہ اُس سے ذاتی طور پر تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ جب وہ پیسے لے آیا ہم سب کے تو ہم نے میر صاحب کو فون کیا اور کہا کہ یہ پیسے لے آیا ہے آپ کے سامنے یہ سب کو پہنچ جائیں گے۔ اب تین ماہ کے سب کے پیسے مل گئے تھے۔ (جاری ہے)

”بوریوالہ میں رانا محمد شاہد نے ’اطراف‘ کو اداروں۔ بازاروں۔ اور درسگاہوں میں متعارف کروایا ہے۔ موضوعات بہت مختلف تلاش کرتے ہیں۔ زبان بہت سادہ۔ تحقیق خاص طور پر کرتے ہیں۔ جولائی کے چھٹیاں نمبر کے لیے انہوں نے محبت اور محنت سے یہ تحریر ارسال کی۔ لیکن اس کا ایک حصہ ٹیکنالوجی کی نذر ہو گیا۔ رانا محمد شاہد اور قارئین سے معذرت کے ساتھ یہ دلچسپ حصہ بھی قارئین کی نذر ہے۔“

ذاتی جزیروں۔ جہازوں کشتیوں پر۔ کروڑوں ڈالر خرچ

تحریر: رانا محمد شاہد (بورے والا)

یہ بات شاید قارئین کے لیے حیرت اور دلچسپی کا باعث ہوگی کہ دنیا میں کچھ ایسے بھی دولت مند ہیں جن کی کل جائیداد پاکستان جیسے ممالک کے مجموعی بجٹ سے بھی زیادہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے کچھ لوگوں کو بے پناہ وسائل دیئے اور مال و دولت عطا کی۔ گویا کہ اس نظام نے امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر کر دیا۔ دولت کی یہ غیر مساوی اور غیر منصفانہ تقسیم ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ جس کی مثال ہمارے معاشرے میں بھی جا بجا ملتی ہے۔

دنیا کے امیر ترین لوگوں میں سے بیشتر کا کہنا ہے کہ ہفتے کے تین دن کام اور باقی دن آرام کیا جائے۔ زیادہ چھٹیاں اور کم کام کرنا کس کی خواہش نہ ہوگی۔ ہمارا موضوع دنیا کے امیر ترین لوگوں کی چھٹیاں ہیں۔ دنیا کے یہ کھرب پتی لوگ اپنی چھٹیاں شاہانہ انداز سے مناتے ہیں۔ یہ لوگ چھٹیاں بھی ذاتی جزیروں پر مناتے ہیں کبھی پرتعیش گھروں جہازوں اور کشتیوں پر۔ مائیکروسافٹ کے بانی اور ایک طویل عرصہ تک دنیا کے امیر ترین شخص رہنے والے بل گیٹس اکثر چھٹیاں ایسی جگہوں پر گزارتے ہیں جہاں انہیں خیراتی کاموں میں معاونت کرنا ہوتی ہے۔ صحت تعلیم اور غربت میں کمی کے لیے وہ ہندوستان افریقہ اور دیگر ممالک کا دورہ کرتے ہیں۔ جہاں لوگوں کی اکثریت زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم ہے۔ اسپیس ایکس کے سی ای او اور دنیا کے امیر ترین افراد میں سے ایک ایلون مسک اپنی چھٹیوں کا بھرپور اہتمام کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ میکسیکو ہوائی اور دبئی جیسے ممالک کا رخ کرتے ہیں۔ ایلون مسک اپنے بچوں کو ڈزنی لینڈ لے جانا پسند کرتے ہیں۔ کچھ ارب پتی اپنی چھٹیاں اعلیٰ درجے کی شاپنگ کر کے گزارتے ہیں۔ مثلاً سعودی شہزادہ اور معروف بزنس مین ولید بن طلال نے ایک بار پیرس میں فورسیزنز جارج پنجم میں ایک دن کی شاپنگ میں کئی ملین ڈالر خرچ کر ڈالے۔ کچھ کھرب پتی مہنگی پارٹیاں کر کے چھٹیاں مناتے ہیں۔ علی بابا کے شریک بانی جیک ما چھٹیوں کے لیے ہوائی کا رخ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ اہو کے جزیرے میں ایک گھر کے مالک ہیں۔ جہاں وہ چھٹیوں میں اپنے خاندان کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ سرفنگ اور آرام کرتے ہیں۔ ورجن گروپ کے بانی رچرڈ برانسن بھی ایک ذاتی جزیرے نیکر آئی لینڈ کے مالک ہیں۔ وہ یہاں دنیا کے مشہور لوگوں کی غیر معمولی میزبانی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں وہ اپنے مہمانوں کو ساحلوں جزیروں اور صاف فیروزی

بل گیٹس خیراتی کاموں میں معاونت کے لیے

پانی کا دلکش نظارہ بھی فراہم کرتے ہیں۔ جو دیکھنے والوں کے لیے ایک ناقابل فراموش تجربہ ہوتا ہے۔

ایمیزون کے بانی اور ارب پتی جیف بیزوس بحرالوقیانوس میں پائے جانے والے گالا پاگوس جزائر میں چھٹیاں گزارتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خاندان کے ساتھ کئی بار ان جزائر کا دورہ کیا۔ ان جزائر کی خاص بات قدرتی خوبصورتی اور منفرد جنگلی حیات ہے۔ اگر یومیہ

ایلون مسک بچوں کو ڈزنی لینڈ لے جاتے ہیں

تعطیلات کے بجٹ کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ جیف بیزوس نے مبینہ طور پر اپنی چھٹیوں میں استعمال کے لیے نجی جیٹ طیارے پر ہی 65 ملین ڈالر خرچ کر ڈالے۔ سابق امریکی صدر اور ارب پتی

دنیا کے امیر ترین لوگوں کی چھٹیاں

ڈونلڈ ٹرمپ بھی دنیا بھر میں چھٹیاں گزارتے ہیں۔ وہ ہوائی ایسین اور یورپ جاتے ہیں۔ تاہم ان کی پسندیدہ جگہ فلوریڈا میں مارا لاگو ہے۔ جہاں ان کے نجی کلب اور اسٹیٹ ہے۔

ان چھٹیوں کی خوشی کا کیا بتائیں کہ گرمیوں کی یہ چھٹیاں عید کی طرح لگتی تھیں۔ اس وقت شاید وقت کی چال بہت دھیمی تھی۔ دوپہریں پرسکون اور بہت طویل ہوتی تھیں۔ ان طویل دوپہروں میں بچوں کے رسالوں کا مطالعہ عجیب سرشاری لاتا تھا۔ بچوں کے دو رسالے نونہال اور آنکھ مچولی (جو پہلے سلیم مغل اور پھر ڈاکٹر طاہر مسعود کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا (نیوز ایجنسی سے لاتے اور ان کا مطالعہ تصور کی ایک انوکھی دنیا میں لے جاتا تھا کہ جہاں بچوں کی شرارتوں اور بے فکری کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ کبھی پھول اور تعلیم وتربیت بھی پڑھ لیتے تھے۔ بچوں کے یہ مخصوص رسالے ہوتے اور نت نئی کہانیاں۔ مجھے یاد ہے کراچی سے محمد اسمعیل یونس کھتری نامی ایک قلمی دوست نے محمود شام کی زیر ادارت شائع ہونے

ایمیزون کے بانی بحر اوقیانوس کے جزیرے میں

والے ''ٹوٹ بٹوٹ '' کے کچھ شمارے مجھے بھیجے۔ یہ 1995 کے ابتدائی مہینوں کی بات ہوگی۔ ٹوٹ بٹوٹ بورے والا نہیں آتا تھا۔ مجھے یاد ہے اسمعیل کھتری صاحب کو شکریہ کا جوابی خط رجسٹری کروانے کے لیے ڈاک خانے گیا تو متعلقہ کلرک نے نام پڑھ کر کہا۔ اسمعیل کھتری۔۔۔ کھتری تو ہندو ہوتے ہیں۔ بچوں کے یہ رسالے ہمارے بچپن کا سب سے بڑا رومانس تھا۔ سب سے بڑی بات کہ بچوں کے ان رسالوں میں چھوٹی موٹی تحریریں لکھنے کی وجہ سے ہماری لکھائی بہت اچھی ہوگئی تھی۔ سکول کے کئی طالب علم اپنی کاپی یا رجسٹر پر نام وغیرہ لکھوانے کے لیے ہماری ہی خدمات لیتے تھے۔

چھٹیوں کا مطلب ہم نے چھٹیاں ہی رکھا تھا۔ وہ سب کام کرتے جو دل کرتا۔ کھیل کود رسالے پڑھنا۔۔۔ مطلب میری چھٹیاں میری مرضی۔

ان چھٹیوں میں جو چیز شوق سے کھاتے وہ گولہ گنڈہ اور قلفی تھے۔ گولہ گنڈا تو سکول میں بھی پڑھائی کے وقفے میں گیٹ کے باہر موجود ریڑھی والے سے ضرور کھاتے اور برف چوستے چوستے ختم کر دیتے۔ گرمی کی لہر میں گولہ گنڈے کے وہ ذائقے آج بھی یاد ہیں۔ ریڑھی والے سے کہہ دیتے کہ ریڑھی پر موجود سارے ذائقے ہمارے گولہ گنڈے میں انڈیل دیجیے۔ مٹھائی میں شوق سے پیسٹری کھاتے تھے جو فرمائش پر اکثر ابلوا دیتے تھے۔

آخر میں ہمارے بچپن کی محبت ''ہمدرد نونہال'' (جسے پڑھا بھی بہت اور اس میں لکھا بھی بہت) کے مئی 1961ء کے شمارے میں چھپی

حامد اللہ افسر کی گرمیوں کی چھٹیوں پہ لکھی نظم سے کچھ اشعار

مشکل سے پھر اسکول نہ جانے کے دن آئے
بے فکری سے پھر وقت گنوانے کے دن آئے
کر دی تھی کتابوں نے ہماری تو زباں بند
گھر بھر میں اب اک شور مچانے کے دن آئے
وہ دن گئے خوش رہنے کو جب بھولے ہوئے تھے
ہنسنے کے دن آئے ہیں ہنسانے کے دن آئے
گھر پر بھی تھے گھیرے ہوئے اسکول کے دھندے
آزادی سے اب موج اڑانے کے دن آئے
بہنوں کو ستایا کبھی بھائیوں کو چڑایا
لڑنے کے دن آئے ہیں لڑانے کے دن آئے
پھر لوٹیں گے ہم چاندنی راتوں کی بہاریں
پھر چھت پہ پلنگوں کے بچھانے کے دن آئے
کیوں اب بھی پسینوں میں شرابور ہو افسر
ندی پہ کہیں جاکے نہانے کے دن آئے

❀❀❀

مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیوں بنا؟

”بنگلہ دیش کیا پھر مشرقی پاکستان بن رہا ہے۔ سید ارتقا احمد زیدی کے تجربات مشاہدات بہت دلچسپی سے پڑھے جا رہے ہیں۔ یہ مشاہدات بنگلہ دیش کی نئی صورت حال کو سمجھنے میں بہت مدد کر سکتے ہیں۔ ’اطراف‘ کی یہی انفرادیت ہے کہ دنیا۔ عالم اسلام اور جنوبی ایشیا جن حالات سے گزر رہا ہے ’اطراف‘ کے صفحات ان کا پس منظر سامنے لے آتے ہیں۔ ماضی حال کو جاننے اور مستقبل کی پیش بندی میں ہمیشہ معاون ہوتا ہے۔“

ہرے بھرے ڈھاکہ میں آخری دن کی محبتیں

قسط نمبر 10

☆تحریر: سید ارتقا احمد زیدی

ڈیم جاتے ہوئے اور وہاں سے واپسی پر مورشید نے پوری فیملی کے ساتھ مختلف جگہوں پر فوٹو گرافی کی۔ بنگلہ دیش اپنی ہریالی اور قدرتی مناظر دریاؤں اور ندیوں کی وجہ سے ایک قابل دید جگہ ہے۔ اس دورے میں میرا یہ آخری دن تھا۔ اگلے روز شام کو میری اسلام آباد کے لئے فلائٹ تھی۔ مورشید نے ڈیم سے واپسی پر گاڑی کا رخ اپنے گھر کی طرف کروالیا اور مجھے پتہ ہی نہ چل سکا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ مجھے ہوٹل چھوڑ کر مورشید اور اس کی فیملی اپنے گھر جائیں گے۔ اپنے گھر پہنچ کر اس نے بڑی محبت سے کہا رات کا کھانا اس کی فیملی کے ساتھ کھاؤں۔ اس کے والد اور والدہ نے بھی بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ کھانے کے دوران اس کی بیوی نے بتایا کہ ہمارے لئے خاص طور پر روٹی تیاری کی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ بنگلہ دیش میں خاص مہمانوں کی روٹی سے اسی طرح تواضع کی جاتی ہے جس طرح پاکستان میں مہمانوں کے لئے پلاؤ یا بریانی بنائی جاتی ہے۔ کھانے کے بعد مورشید کے والدین کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اور رات گئے مورشید نے مجھے ہوٹل چھوڑا۔ اگلے دن شام کو میری

مورشید۔ رفیق الاسلام۔ بنگلہ دیش کے موجودہ حالات سے پریشان

فلائٹ کے وقت مورشید مجھے الوداع کہنے آیا تو اس نے مجھے فوٹوز کی البم پیش کی۔ یہ فوٹو وہ اپنے کیمرے سے لیتا رہتا تھا۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی انہیں بنوا کر البم میں مجھے پیش کرے گا۔ اس نے البم کے پہلے صفحہ پر بہت اچھے القاب تحریر کئے اور دعا کی کہ ہم جلد دوبارہ ملیں اس نے کچھ تحائف میرے اور میری بیوی کے لیے دیئے۔ میں بہت شرمندہ ہو رہا تھا کہ مورشید نے میرا اتنا خیال رکھا۔ سیر کرائی اور تحائف دیئے اور فوٹو البم بھی دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اسکا یہ احسان کیونکر اتاروں گا۔

میری یہ مشکل اگلے سال حل ہو گئی ہے۔ مجھے جون 2005 میں بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان تجارتی معاہدہ کے امکانات پر ایک رپورٹ تیار کرنے کے لئے آٹھ دن کے لئے ڈھاکا کا دورہ کرنے کا موقع ملا۔ میں نے دل کھول کر مورشید اور اس کی فیملی کے لئے تحائف خریدے۔ ان آٹھ دنوں میں بھی مورشید نے مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آج کل بھی میرا اس سے رابطہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بنگلہ دیشی دوست رفیق الاسلام خان سے جس کے

مورشید ملت

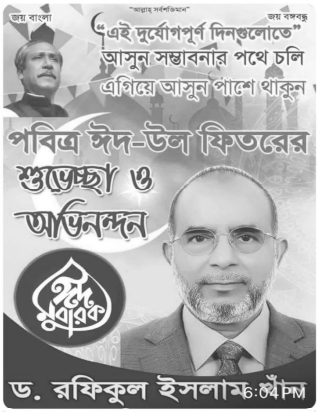

رفیق الاسلام خان

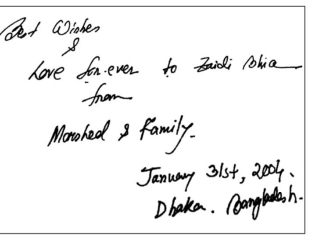

مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیوں بنا؟

ساتھ میں نے 1984 میں انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سٹڈیز Instutute of Social Studies ہیگ نیدرلینڈ میں 15 ماہ ہوسٹل میں گزارے تے جب ہم ایم اے سوشل اسٹڈیز کے طالب علم تھے سے بھی فون پر بات چیت ہوتی رہتی ہے۔آج کل رفیق الاسلام خان سے تقریباروزانہ بات ہوتی ہے۔ بنگلا دیش کے موجودہ حالات سے وہ ان دنوں بہت پریشان ہیں

بنگلہ دیشی عوام۔حسینہ واجد کی انڈیا دوستی سے ناراض تھے

۔اس کا کہنا ہے کہ بنگلہ دیش میں ایک مستحکم حکومت قائم ہونے میں بہت وقت لگے گا اور یہ بھی خطرہ ہے کہ چونکہ انڈیا نے بنگلہ دیش میں حسینہ واجد کے 15 سالہ دور میں بہت سرمایہ کاری کی ہے اور حسینہ واجد کی حکومت کا جھکاؤ مکمل طور پر انڈیا کی طرف تھا۔ اس لیے انڈیا کی پوری کوشش ہوگی کہ نئی منتخب حکومت بھی انڈیا کے زیر اثر رہے جو کہ بظاہر بہت مشکل نظر آرہا ہے۔عوام دو وجہ سے حسینہ واجد کے خلاف ہو گئے۔پہلی وجہ حسینہ واجد بہت زیادہ ہندوستان کے زیر اثر آ گئی تھی۔ اور ہندوستان کی مداخلت بڑھتی جارہی تھی۔ دوسری وجہ حسینہ واجد کی بے انتہا کرپشن تھی۔ رفیق الاسلام نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ وہ عوامی

حسینہ واجد نے پارٹی ٹکٹ کا معاوضہ ڈالروں کی بڑی رقم میں طلب کیا

لیگ کا بڑا حامی ہے اور گزشتہ تینوں الیکشن میں جو عوامی لیگ نے جیتے ہیں وہ پارلیمنٹ کا ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔رفیق الاسلام بیگ سے ماسٹر کی ڈگری حاصل کر کے امریکہ چلا گیا تھا اور ریاست میسوری Missouri میں اپنا کاروبار کر رہا ہے۔وہاں اس نے بہت دولت بنائی اور اب اس کی خواہش تھی کہ بنگلہ دیش میں سیاست میں قدم رکھے۔وہ امریکہ جانے سے پہلے بنگلہ دیش میں پروشیکا نامی این جی او کا بانی تھا اور اس نے ڈھاکا کے گردونواح میں اس کی بہت سی شاخیں قائم کی ہیں اور غریبوں کے لئے لنگر اور ان کے روزگار کے لئے دیہی مراکز قائم کیے ہیں۔وہ امریکہ جا کر بھی اپنی این جی او کے لیے مالی امداد بھیجتا رہا اور ہر سال رمضان ڈھاکا میں گزارتا اور پروشیکا کے ذریعے غرباء کی مدد وسیع پیمانے پر کرتا رہا۔اس طرح اس نے اپنا ایک ووٹ بینک تیار کر لیا تھا اور اسے سو فیصد امید تھی کہ اگر اسے عوامی لیگ کا ٹکٹ مل گیا تو پارلیمنٹ کا ممبر آسانی سے بن جائے گا۔گزشتہ الیکشن سے کئی ماہ پہلے وہ ڈھاکا پہنچ گیا۔اس مرتبہ اس نے حسینہ واجہ سے کھل کر بات کی وہ تیسری مرتبہ عوامی لیگ کے ٹکٹ کے لئے امریکہ سے آیا ہے۔آخر کیا وجہ ہے کہ اسے ٹکٹ

مورشید ملت اوران کے اہل خانہ

نوبل انعام یافتہ محمد یونس۔سیدارتقا احمد زیدی کے صاحبزادے ڈاکٹر جنید کے ساتھ

کیوں نہیں ملتا۔حسینہ واجد نے اسے بتایا کہ اس مرتبہ اسے پارٹی ٹکٹ دے دیا جائے گا اور سب سے اہم وزارت داخلہ اس کے حصے میں آئے گی۔رفیق الاسلام بے حد خوش ہوا کر آخر کار وہ حسینہ واجد کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔لیکن یہ خوشی زیادہ دیر قائم نہ رہی جب حسینہ واجد نے ایک کاغذ جس میں ایک بھاری رقم ڈالروں میں لکھی ہوئی تھی اس کی طرف بڑھا دیا اور کہا کہ یہ رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی جائے۔رفیق الاسلام نے کہا کہ رقم بہت زیادہ ہے اس کے لئے اسے امریکہ میں اپنی تمام

نگراں سربراہ محمد یونس میرے بیٹے جنید کے کلینک میں مشورے کے لیے آئے

پراپرٹی اور کاروبار بیچنا پڑے گا۔حسینہ واجد نے جواب دیا اگر اسے منظور نہیں تو وہ یہ رقم ٹکٹ کے کسی اور امیدوار سے لے لیگی۔ رفیق الاسلام نے کہا کہ اچھا ہی ہوا جو اس نے حسینہ واجد کی بات نہیں مانی ورنہ یہ رقم ڈوب جاتی۔

رفیق الاسلام نے کہا کہ وہ اس وقت ڈھاکا میں ہی مقیم ہے اور آئندہ ہونے والے الیکشن میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لے گا۔اس کا کہنا ہے کہ ڈھاکہ میں پچھلے دنوں جو کچھ ہوا۔وہ کوٹہ سسٹم کے خلاف احتجاج کے نتیجے میں نہیں ہوا بلکہ حسینہ واجد کے خلاف لاوہ بہت عرصے سے اہل رہا تھا کیونکہ حسینہ واجد اور اس کے وزرا نے کرپشن کی انتہا کر دی تھی۔طالب علموں کے احتجاج کو بھی بہت تشدد سے کچلنے کی کوشش کی۔اس کا کہنا ہے کہ دنیا کو آہستہ آہستہ پتہ چلے گا کہ طالب علموں پر کیا بیتی۔کم از کم ساڑھے چھ ہزار طلبہ کو ہلاک کیا گیا۔رفیق الاسلام کا خیال ہے کہ عبوری حکومت بہت جلد الیکشن کرائے گی کیونکہ اس کے سربراہ نوبل انعام یافتہ محمد یونس نے جو اس وقت 84 سال کے ہیں اسی شرط پر چیف ایڈوائزر بننے کی حامی بھری ہے کہ وہ فوراً نئے الیکشن کرا کر عہدہ چھوڑ دیں گے کیونکہ ان کی صحت اچھی نہیں ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ محمد یونس کچھ سال پہلے امریکہ کے شہر میمفس Memphis اپنے کسی عزیز سے ملنے آئے ہوئے تھے۔انہیں امراض سینہ کے معالج سے مشورہ کرنے کی ضرورت پڑ گئی۔وہ میرے بیٹے ڈاکٹر جنید کے کلینک آئے جو ماہر امراض سینہ Pulmonologist ہے۔(جاری ہے)

صحافیوں کی خدمات کا اعتراف

انجمن مبصرین کے روح رواں راشد لطیف نے سندھ بوائے اسکائوٹس آڈیٹوریم میں اُردو کے ممتاز صحافیوں۔ محمود شام۔ نصیر ہاشمی ۔ صفدر علی صفدر ۔ سہیل دانش۔ مقصود یوسفی اور اخلاق احمد کی پذیرائی میں تقریب منعقد کی۔ انجمن مبصرین کو شہر کی خدمت کرتے 50 سال ہوگئے ہیں۔ ہماری درخواست پر سہیل دانش صاحب اس خوبصورت شام کی رُوداد 'اطراف' کے قائین کی نذر کررہے ہیں۔

شام جی کی باتیں سن کر مایوسی چھٹ گئی

سہیل دانش کی دل میں اترتی رُوداد

انجمن مبصرین کے روح رواں برادرم راشد لطیف نے 27 جولائی کو ایسی محفل سجائی کہ میرا یہ تاثر زائل ہوگیا کہ شہر قائد میں گذشتہ 50 برس سے جگمگاتی سماجی اور ثقافتی تقریبات کا وہ سلسلہ ماضی کی کسی کتاب میں جذب ہوگیا ہے جس کے ذریعے سماج کے مختلف شعبوں

نصیر ہاشمی کی گفتگو میں احساس۔ مٹھاس

کے انمول لوگوں سے ملاقات کا موقع ہاتھ آجاتا تھا۔ سچ پوچھیں تو وہ یادیں بھی بھٹک رہی ہیں وہ بستیاں وہ شخصیات وہ منظر وہ چہل پہل اخوت و ایثار کے جذبے جو یادوں میں کبھی دِل رُبا خوش نما اور نظارہ خیز ہوا کرتی تھیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ شہر اپنی اُس ثقافتی اور تہذیبی پہچان سے محروم ہوتا جارہا ہے۔ یہاں ادبی ذوق وشوق اب مفقود ہوتا جارہا ہے سچی بات تو یہی ہے کہ اب مثالی لوگ بتدریج کم ہوتے جارہے ہیں کل ہی کی تو بات ہے، انجمن مبصرین کے اسٹیج پر محترم محمود شام کو دیکھا اور سنا آواز اور الفاظ میں وہی تہذیبی وقار، راہ ورسم میں وہی محبت و ایثار، شخصی صلاحیتوں کا وہی مظاہرہ جس کی ہر ادا میں تربیت ذات کی عملداری۔ ساری یادیں لوٹ آئیں یوں محسوس ہوا۔ وقت تھم سا گیا ہے۔ یہ تو وہی لوگ ہیں لہجے میں وہی چاشنی، وہی وضعداری اور عزت نفس سے مالا مال لوگ، شام جی کی باتیں سُن کر یادوں میں پھیلی مایوسی چھٹ گئی، برادرم نصیر ہاشمی سے ملاقات رہی اُن کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ محبت بھرے احساس اور جذبات سے لبریز باتوں کی مٹھاس۔ اُن کی شخصیت پر تو گزرے وقت اور زمانے کی تلخیوں اور کرواہٹ کے باوجود کوئی شکن نہیں آئی۔ محبت بھرے دھڑکتے دِل کی دھک دھک آج بھی اتنا خوشنما اور دلپذیر ہے جتنی کئی دھائیاں قبل ہم نے "جنگ" کے نیوز روم میں ایک سینئر کے طور پر محسوس کی تھی کون ہے جو اُن کی رواداری اور وضعداری کا قائل کل اور آج نہ رہا ہو۔ اِس محفل میں برادر عزیز سید صفدر علی بھی موجود تھے۔ اُن کی باتیں کیا ہیں پھلجھڑیاں ہیں اُن کی محفل میں کون ہے جو محظوظ نہ ہو۔ ایک چوکنے اور بیدار رپورٹر کے طور پر اُنہیں اس شہر کی ہر

صفدر علی کی پھلجھڑیوں سے کون محظوظ نہیں ہوتا تھا

کروٹ ازبر ہے بچپن سے لے کر آج تک اِس شہر سے وابستہ ہزاروں تلخ وشیریں یادوں کے وہ عینی شاہد اور گواہ ہیں۔ وہ پرانی باتوں اور یادوں کو تازہ کرکے افسردہ ہوجاتے ہیں وہ بتاتے ہیں سب تبدیل ہوگیا ہے۔ پرانے مکانات کی جگہ نئے مکانات بن گئے ہیں، سڑکوں اور پلوں کا جال بچھ گیا ہے۔ ہوٹل اور سینما ختم کرکے اُن

کی جگہ کثیر المنزلہ فلیٹ اور شاپنگ مال بن گئے ہیں کرکٹ گراؤنڈ اور لائبریریاں ختم ہوگئی ہیں بیشتر علاقے بلڈرز اور قبضہ مافیا کے زیر اثر کمرشل ہوگئے ہیں سڑکیں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں سیوریج کا پانی جگہ جگہ پھیلا ہوا ہے۔ ٹریفک کے بڑھتے ہوئے شور نے سماعتوں کو پرندوں کی آوازوں سے محروم کردیا ہے۔ سڑکوں کے کنارے لگے درخت کاٹ دیئے گئے ہیں۔ کوئی منظر خوش کن نہیں اُنہوں نے تجویز پیش کی کہ ایسی تقریبات منعقد ہوتی رہنی چاہیں اور یہ بھی کہ راشد لطیف کی حوصلہ افزائی کے لئے اُنہیں گولڈ میڈل ملنا چاہئے۔ جسے جناب اشفاق رسول نے فوراً قبول کرتے ہوئے اعلان کردیا کہ راشد لطیف کی تقریب تاجپوشی اِسی سال منعقد ہوگی جس میں شہر کے سرکردہ شخصیات کو مدعو کیا جائے گا۔ جناب مقصود یوسفی کے کیا

اخلاق احمد کو یقین۔ امید کی صبح ضرور طلوع ہوگی

کہنے وہ اپنی شخصیت کی طرح سادہ اور انتہائی وضعدار صحافی ہیں ایک ممتاز اخبار کے ایڈیٹر ہونے کے باوجود وہ عجز وانکسار کی مثال ہیں انہوں نے کہا کہ یہ دُرست ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ زندگی مشکل ہوگئی ہے اب زندہ رہنے کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے صحافت کا شعبہ بھی خصوصاً پرنٹ میڈیا سکڑ گیا ہے۔ سوشل میڈیا نے اپنی تیزی وتندی سے معاشرے کو متاثر کیا ہے۔ لیکن تشویش کی بات یہ ہے کہ خبر کی کریڈیبلٹی متاثر ہوئی ہے اور خبر کا اصل زیور ہی اُس کا اعتبار ہے۔ برادرم اخلاق احمد نے اپنی خوبصورت باتوں

مقصود یوسفی۔ سادہ۔ وضعدار۔ خبر کا اصل زیور۔ اعتبار

سے سب کو متاثر کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ انسان کی زندگی میں کامیابیاں اور محرومیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، حالات نے وقت کو بدلا یا وقت نے حالات کو بدلا۔ اس طرح صحافت نے بھی اپنا رنگ اور پینترا بدلا اب پرنٹ میڈیا کا قاری بڑی تیزی سے گھٹتا جارہا ہے اِس کا رسپانس کمزور ہوگیا ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر موج موج ہے۔ تو وہ کناروں سے ضرور ٹکراتی ہے اگر ہوا ہوا ہے تو قطرہ خون میں ضرور اُترتی ہے اور اگر روشنی روشنی ہے تو وہ اندھیروں کا سینہ ضرور چیرتی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ مجھے صحافت کو اپنے بامِ عروج پر عملی طور پر چھوڑ کر کبھی کوئی پچھتاوا نہیں ہوا۔ اُنہوں نے کہا کہ بہت کچھ بدل گیا ور بہت کچھ بدلنے والا ہے۔ یہ دُرست ہے کہ ہمارے معاشرے میں مایوسی ہے لیکن یاد رکھیں کہ قوموں کی زندگی میں اس سے بُرے وقت بھی گزرے ہیں ہمارے معاشرے کا زوال کوئی زوال نہیں ہمارا بحران تو تاریخ کے بحرانوں میں کوئی معانی نہیں رکھتا ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ اُمید کی صبح ضرور طلوع ہوگی۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ قوموں کا مقدر بدلتا ہے تو منظر دیکھتے ہی دیکھتے یکسر بدل جاتا ہے۔ یہ تقریب جو اِن نامور صحافیوں کی خدمات کے اعتراف میں منعقد کی گئی تھی جنہوں نے کیا خوب لکھا، اپنا حق ادا کیا، کوثر و تسنیم سے دھلی زبان احساسات سے مہکتے خیالات اور دلوں میں اُتر جانے والے الفاظ۔ واہ واہ کیا کہنے۔ آخر میں برادرم مہمان خصوصی جناب سیکریٹری سندھ حکومت جناب شارق احمد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم زندہ ہیں تو ہمارے لئے خدا کی طرف سے ایک کھلا اور واضح پیغام کہ ہم زندگی کے ہل سے اِس کیاری میں اپنی پسند کے پھول اُگانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اِس لئے من حیث القوم ہمیں نا اُمید نہیں ہونا چاہئے اُنہوں نے ایوارڈ پانے والے ممتاز صحافیوں کو مبارکباد دی ۔ انجمن مبصرین پاکستان کے صدر ڈاکٹر

انجمن مبصرین کی گولڈن جوبلی کی تقریب نے ماضی کی شان زندہ کردی

فرقان احمد نے اپنے اختتامی کلمات میں تمام شرکاء اور مہمانانِ گرامی کا شکریہ ادا کیا اور اس اُمید کا اظہار کیا کہ آئندہ اِس طرح کی تقریبات کا سلسلہ جاری رکھا جائے گا تاکہ زندگی کے مختلف شعبوں کی۔ نامور شخصیات کی خدمات کا اعتراف کیا جائے اور شہر کی ثقافتی زندگی میں روشنیاں بکھیرنے کے لئے انجمن مبصرین اپنا کردار ادا کرسکے۔ ❁

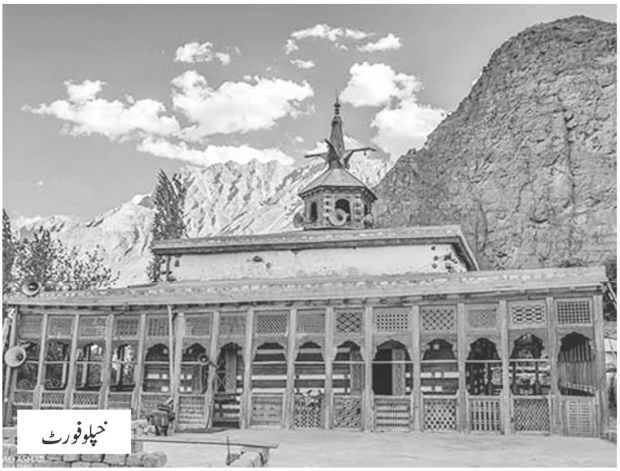
خپلو فورٹ

ظہیر قندیل شاعر بھی منفرد ہیں۔ اور اس سفر نامے میں تو وہ ایسی شگفتگی ظاہر کر رہے ہیں کہ سید ضمیر جعفری۔ کنہیا لال کپور یاد آجاتے ہیں۔ قارئین کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ مفت میں اسکردو کی سیر کروا رہے ہیں۔ راستوں سے آگاہ کر رہے ہیں۔ سفر لمبا ہے۔ سفر نامہ بھی طویل ہے۔ مگر قاری کہیں بھی اکتاتا نہیں ہے۔ ملاحظہ کیجئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

گوری نے پھر آگے چلنے سے انکار کر دیا

قسط نمبر 3

تحریر: ظہیر قندیل

22 جون 2023ء جمعرات

رات بلتورو گیسٹ روم میں گزری۔ صفائی کے معاملے میں یہاں کچھ اچھا تجربہ نہیں رہا۔ تھکاوٹ نے بستر پر گرنے کے کچھ ہی دیر بعد ہمیں سلا دیا تھا لیکن رضائی منہ پر اس کی بدبو کی وجہ سے نہیں لی جا سکی۔ مہمان خانے کا واش روم البتہ بہت اچھا تھا۔ صبح اٹھ کر گرما گرم پانی سے دوبارہ غسل کیا۔ اسکردو میں گیسٹ ہاؤس میں گرم پانی ملنا

عورتیں پیٹھ پر ٹوکریاں باندھے محنت کر رہی ہیں۔ مرد بے کار گپ شپ کر رہے ہیں

بھی ایک بڑی نعمت سے کم نہیں۔ آج ہمارا پروگرام لمن ٹھو کا آب شار اور 'خپلو' جانے کا تھا۔ احمد ندیم بھائی نے گوری کو اسٹارٹ کیا، چلے، حسب معمول کوئٹہ بلتستان کیفے میں جا کر ناشتا کیا۔ وہاں سے کارگل روڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ سعد بار بار کہہ رہا تھا کہ گاڑی روکیں کچھ کھانے پینے کا سامان لے لوں۔ حسین آباد کے بعد اسکردو بالا میں ٹھوروگو نالے سے گزر رہے تھے کہ سعد کو ایک دکان نظر آئی، سعد نے کہا: بابا گاڑی روکیں، میں کچھ لے لوں۔" گاڑی روکی گئی۔ وہ بھاگ کر گیا اور چپس وغیرہ کے پیکٹ لے آیا۔ گوری دوبارہ اسٹارٹ کی گئی۔ مگر یہ کیا؟ وہ کسی گیئر میں جانے پہ تیار ہی نہ تھی۔ اس کی یہ ضد ہمیں ''گوری کا حسن چٹکیوں میں جائے'' جیسی ضرب المثل یاد کرا گئی۔

ہم نے گوری سے کہا: گوری مت کر گورے رنگ پہ گمان، یہ ہے کوئی دن کا مہمان، اب بات ہماری مان اور چل پڑ۔" گوری کا جواب تھا۔ چل پرے ہٹ۔ "مکینک کو فون کیا گیا۔ مکینک نے کہا۔ لے آئیں دیکھ لیتے ہیں۔" مگر کیسے لے آئیں، وہ تو چلنے کو تیار ہی نہ تھی۔ اس کی منتیں کیں، ترلے کیے، قتیل شفائی کی غزل گنگنائی۔ چاندی جیسا رنگ ہے تیرا سونے جیسے بال۔۔۔ اک تو ہی دھنوان ہے گوری باقی سب کنگال" مگر مجال ہے گولی کے کانوں پر جوں رینگی ہو۔ اس نے ہمیں واقعی کنگال کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ ایک مقامی مکینک کو ڈھونڈا گیا۔ اس نے گاڑی کو بشری (مینوئل) ڈی گیئر میں ڈالا۔ اور کہا کہ اسے اب اسکردو شہر لے جائیں گیئر مت بدلنا ورنہ پھر یہی مسئلہ ہو جائے گا۔ گوری کو واپس اسکردو میں اسی مکینک کے دربار پہنچایا گیا۔ اس نے کہا کچھ پرزے بدلنے پڑیں گے، اب دعا کریں وہ مل جائیں۔ مل گئے تو آدھے پون گھنٹے میں کام ہو جائے گا۔" ہم نے دعائیں شروع کیں۔ کام شروع ہوا۔ مگر وقت زیادہ لگنے لگا۔ میں اور فہد بازار کی طرف چل نکلے۔

ہم پچھلے کئی دن سے ایس کام کی سم ڈھونڈ رہے تھے۔ سعد کو اگلے ہی دن ایس کام کی سم مل گئی تھی مگر وہ کسی کام کی نہ نکلی۔ اس میں بہ صد ہزار کوشش فور جی نیٹ ورک نہ چل سکا۔ ایس کام کے دفتر گئے اور وہاں بیٹھی خاتون سے سم طلب کی۔ اس نے بہت نخرے دکھائے، کہ سم ختم ہو گئی ہے، آپ فلاں اسٹور سے خرید لیں۔ میں نے عرض کی، وہاں سے کئی بار نا کام و نامراد لوٹ چکا ہوں۔ آپ سے نگاہِ کرم کی استدعا ہے۔ اس نے کہا: کیا آپ دونوں کو سم چاہیے؟" ہم نے کہا جی ہاں۔ وہ بولی صرف ایک ملے گی۔ ہم نے کہا چلو ایک ہی سہی۔ اس نے ساڑھے تین سو کی سم اور ساڑھے چھے سو کا دس جی بی

اونچے پہاڑ۔ سفید پوش برفانی چوٹیاں۔ دریا کے گرد چمکتی ریت

انٹرنیٹ بنڈل دیا۔ جو بنڈل ہی نکلا۔ سم کی سیٹنگ کی گئی مگر فور جی نیٹ نے نہ آنا تھا نہ آیا۔ انھوں نے ایک نمبر ملانے کو کہا کہ اس نمبر پر اپنی شکایت درج کروائیں۔ کئی منٹ انتظار کے بعد رابطہ ہوا تو شکایت سننے والی بی بی نے کہا۔ آپ کی شکایت نوٹ کر لی گئی ہے جلد ہی ازالہ ہو گا۔ وہ ازالہ تو نہ ہوا۔ یہ سوچ کر واپس آ گئے کہ جب کبھی گلگت بلتستان واپس جائیں گے تو شاید اس وقت یہ شکایت رفع ہو چکی ہو۔ ابھی گاڑی ٹھیک نہیں ہوئی تھی اس لیے خشک میوہ جات خریدنے کے لیے وہیں جامع مسجد روڈ پر چشمہ بازار میں واقع بسم

چقچن مسجد

اللہ ڈرائی فروٹ کی دکان پر چلے گئے۔ وہاں پر انھوں نے ہمیں یہاں کی معروف تمورو جڑی بوٹی کا قہوہ پلایا۔ ہم تمورو پہلے بھی کئی بار خرید چکے ہیں اور اس کا قہوہ پی چکے ہیں۔ ہم نے قہوے کی تعریف کی اور تمورو کا سو روپے والا پیکٹ تین سو میں خرید لیا۔ (یہ ہمیں گلگت

خپلو جہاں ہفتے۔ مہینے اور سال بتائے جا سکتے ہیں

میں جا کر معلوم ہوا کہ یہ پیکٹ صرف ایک سو روپے میں وہاں دستیاب ہے)۔ خشک خوبانی، انجیر اور خشک چیری وغیرہ خریدیں۔ اڑھائی ہزار روپے کا بل بنا۔ اتنی دیر میں گوری بھی مان چکی تھی۔ احمد ندیم بھائی اسے وہیں پر لے آئے جہاں ہم لوگ موجود تھے۔

پھر دوبارہ سفر شروع ہوا۔ اس وقت دن کے دو بج چکے تھے۔ طے یہی ہوا کہ وقت بہت ضائع ہو چکا ہے اب سیدھے خپلو جاتے ہیں من ٹھوکا گئے تو کہیں رات ہی نہ ہو جائے۔ دریائے سندھ کے کنارے کنارے خوب صورت روڈ پر گوری دوڑنے لگی۔ ذرا سا آگے گئے تو بائیں طرف دریا کے پار ایک ہری بھری آبادی نظر آئی۔ اس آبادی کا نام 'نڑھ' تھا۔ دریا پر لوہے کے رسوں سے بندھا لٹکتا پل خوب صورت منظر پیش کر رہا تھا۔ اس طرح کے کئی پل اور کئی بستیاں راستے میں نظر آئیں۔ پھر ہمارا گزر ایک اور ہرے بھرے قصبے سے ہوا۔ اس کا نام 'گول' تھا۔ ہم نے دیکھا کہ یہاں کی تقریباً نوے فی صد خواتین کی پیٹھ پر ایک ٹوکری بندھی ہوئی ہے اور وہ ادھر ادھر گھوم رہی ہیں۔ یہ مناظر ہمیں تقریباً پورے بلتستان کے علاقے میں دیکھنے کو ملے۔ ان ٹوکریوں میں کسی میں پھل، کسی میں گوبر، کسی میں پتے اور کسی میں مٹی پڑی ہوئی تھی۔ یہ عورتیں بہت محنت کش ہیں۔ ہم نے وہاں مردوں کو بے کار بیٹھے ہوئے گپ شپ لگاتے دیکھا۔ زیادہ تر عورتیں اپنے بچے پہلو میں اٹھائے، پیٹھ پیچھے ٹوکری لگائے اور ہاتھوں میں بیلچہ وغیرہ لیے ہوئے نظر آئیں۔ ایک جگہ دیکھا کہ مکان بن رہا ہے اور خواتین انھی ٹوکریوں میں سیمنٹ وغیرہ

خپلو قلعہ راجا دولت علی خان نے 1840 میں تعمیر کرایا

ڈالے ہوئے مزدوری پر مامور ہیں۔ یہاں کی محنتی خواتین کو کھیتوں میں کام کرتے بھی اکثر دیکھا۔ مردوں کو یا تو دکان داری کرتے دیکھا یا خود مختاری۔ ''گول'' اچھا خاصا قصبہ ہے۔ یہاں سڑک کے دونوں اطراف سرو قامت سفیدوں کی قطار در قطار صف بندی دل کو موہ لیتی ہے۔ اس طرح ایک فاصلے اور ایک ہی قد و قامت سے لگے درخت کسی چابک دست فوجی دستے کے عکاس تھے۔ 'گول' سے چند کلو میٹر ہی آگے گئے ہوں گے کہ یہاں ایک دوراہے کا سامنا تھا۔ دائیں طرف کی شاہ راہ، کارگل کی طرف جاتی ہے۔ یہی شاہراہ 'من ٹھوکا آبشار' اور 'خاموش آبشار' کی طرف جاتی ہے۔ یہاں سے کھرمنگ ضلع شروع ہوتا ہے۔ دریائے سندھ کا پل پار کر کے بائیں طرف کی سڑک ضلع گانچھے کی ابتدا کرتی ہے۔ اسی ضلعے میں خپلو بھی موجود ہے۔ ہم نے چھومدو پل عبور کیا اور گانچھے چیک پوسٹ پر اپنی شناخت اور شناختی کارڈ چیک کروایا اور آگے چلے۔ ذرا سا آگے دریائے سندھ اور دریائے شیوک باہم ملتے دکھائی دیتے ہیں۔

دریائے سندھ کو وہاں کی لداخی زبان میں سنگھے کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب شیر ہے۔ اس دریا کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دریا شیر کے منھ سے نکلتا ہے اس لیے یہ شیر دریا ہے۔ محترم رضا علی عابدی نے اپنی کتاب شیر دریا'' میں یہی بات بیان کی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ہند کے قدیم لوگوں کا خیال تھا کہ ستلج ہاتھی کے منھ سے نکل کر مغربی سمت میں بہتا ہے۔ گنگا، مور کی چونچ سے نکل کر

جامعہ دارالعلوم بلتستان غواڑی

جنوبی سمت میں بہتا ہے۔ برہم پتر گھوڑے کے منہ سے نکل کر مشرقی سمت میں بہتا ہے۔ اور دریائے سندھ شیر کے منہ سے نکل کر شمالی سمت میں بہتا ہے۔ دریائے سندھ جنوبی ایشیا کا سب سے بڑا دریا ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً 3200 کلومیٹر ہے۔ گارنگ ندی کو اس کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان میں بلتستان کے علاقے میں داخل ہونے سے پہلے یہ دریا ساڑھے چار سو کلومیٹر سفر کر چکا ہوتا ہے۔ دریائے شیوک، جس کے معنی بلتی زبان میں موت کا دریا کے ہیں۔ یہ اپنے خطرناک ہونے کی وجہ سے اس بدنامی کا سزاوار ٹھہرا۔ اس دریا میں بہت سے افراد خودکشی بھی کرتے ہیں۔ کئی بار کئی لاشیں بھارتی مقبوضہ علاقے لیہہ وغیرہ سے بہہ کر یہاں آئی ہیں۔ یہ دریا لداخ سے نکلتا ہے اور بلتستان کے ضلع گانچھے سے بہتا ہوا دریائے سندھ میں آملتا ہے۔ اس کی لمبائی 550 کلومیٹر ہے۔ یہ دریا سیاچن گلیشیر کے ساتھ واقع ریموگلیشیر سے نکلتا ہے۔

اب ہمارا آج کا باقی سفر اسی دریا کے ساتھ ساتھ جاری رہے گا۔ خشک پہاڑوں کے بعد اچانک نخلستان آتا اور وہاں اچھی خاصی آبادی بھی نظر آتی۔ ضلع گانچے میں سب سے پہلے غواڑی کے قصبے نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اس قصبے میں ایک تاریخی دینی درس گاہ 'جامعہ دارالعلوم بلتستان غواڑی' بھی موجود ہے جو ایک سو سال

1370 میں تعمیر کردہ
چقچن مسجد

سے بھی زیادہ عرصے سے قائم ہے۔ ہم نے وہ درس گاہ اس لیے نہیں دیکھی کہ وقت کم تھا اور ہم جلد از جلد خپلو پہنچنا چاہتے تھے۔ یہاں کی زیادہ تر آبادی سنی اور اہل حدیث مسلک سے وابستہ ہے۔ غواڑی قصبے کے جنوب مشرق میں دریائے شیوک پر ایک معلق پل ہے جو اسے دریا کے دوسری طرف واقع گاؤں کورو کے ساتھ ملاتا ہے۔ غواڑی قصبے سے نکلے تو ایک نالہ سڑک کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ پانی خاصی رفتار میں تھا، مگر احمد ندیم بھائی ناران کے راستے میں ایسے کئی نالے باآسانی عبور کر چکے تھے، اس لیے یہاں بھی مشکل درپیش نہیں آئی۔ ذرا فاصلے پر ایک اور معلق پل سے کریس گاہ کی طرف سڑک جاتی ہے۔ اس سے اگلا قصبہ یوگو آیا۔ لفظ ''یوگو'' بلتی زبان کے دو الفاظ سے ماخوذ ہے یعنی ''یول'' اور ''گو''، ''یول'' کے معنی ہے ''گانو'' اور ''گو'' کا معنی ''پہلا''، یعنی ''پہلا گانو''۔ بنیادی طور پر یہ خپلو سلطنت کا پہلا گانو ہے، لہٰذا اسے ''یوگو'' (یول گو) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ بعد میں یہ یوگو ہو گیا۔ یہ گانچھے کے صدر مقام خپلو کے بعد سب سے زیادہ آبادی والا شہر نما قصبہ ہے۔ یہاں کچھ ہوٹل بھی موجود ہیں۔ یہاں کی آبادی بھی سنی العقیدہ ہے اور اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتی ہے۔ مجھے اس قصبے کا نام yugo بہت پسند آیا۔ یوں لگا جیسے کسی جاپانی سلسلۂ خوراک (فوڈ چین) کا نام ہو۔ یوگو جغرافیائی طور پر گانو کھرفق سے متصل ہے، کھرفق سے دائیں طرف ایک راستہ اونچائی پر موجود جھیل 'کھرفق' کی طرف جاتا ہے۔ میں نے چند ہی دن پہلے یوٹیوب چینل ''گرپ اینڈ ٹرپ'' میں اس جھیل کو دیکھا۔ وہاں پہنچنا میرے جیسی جسامت رکھنے والے شخص کے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ اس لیے 'کھرفق' سے آگے نکل گئے۔ اب ہماری آج کی منزل قریب آ گئی۔

ضلع گانچھے کے صدر مقام خپلو پہنچنے سے پہلے ہی اس پورے علاقے کی خوب صورتی کا سحر ہم پر طاری ہو چکا تھا۔ خاموش اور پرسکون دریا کے کنارے کنارے سفر وجد ساطاری کر رہا تھا۔ سیاحت کا مکمل پیکج یہاں ملتا ہے۔ اونچے پہاڑ، خشک اور بنجر چٹانیں، سرسبز و شاداب وادی، دور سفید پوش برفانی چوٹیاں، دریا کے اردگرد پھیلی ہوئی چمکتی ریت سے بنے صحرا، چشمے، ٹھنڈا میٹھا پانی، قدرتی پھل، پرندے، چھوٹی چھوٹی کھیتیاں، وسیع دریا پر جھیلوں کا گماں، پہاڑوں سے بہتی آب شاریں، خپلو میں داخل ہونے سے پہلے اونچے پہاڑ سے نکلتی آٹھی سات آٹھ آب شاریں تو ناقابل یقین

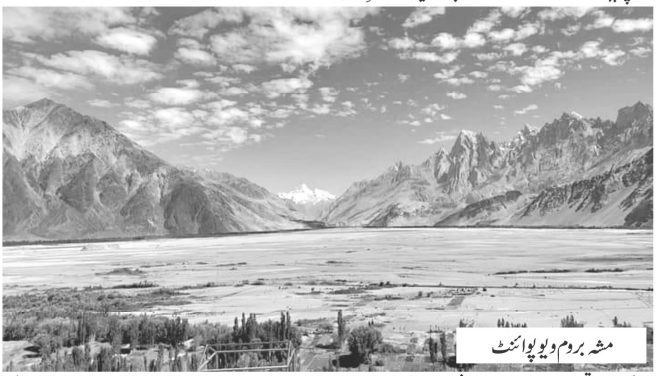
مشہ بروم ویو پوائنٹ

منظر کی عکاس تھیں۔ خپلو نے ہمیں اپنے عشق میں مبتلا کر دیا۔ یہ ایسی جگہ ہے جہاں ہفتے کیا، مہینے اور سال بتائے جا سکتے ہیں۔ پورا ماحول رومان پرور تھا۔ کاش! یہاں میں اپنے اہلِ خانہ سمیت آتا، مجھے فرحت، زید، زینب اور ملائکہ یہاں آ کر بہت یاد آئے۔ وہ یقیناً یہاں بہت لطف اندوز ہوتے۔ یہاں کی صاف ستھری آب و ہوا کا تو کہنا ہی کیا۔ ابھی یہاں لوگ زیادہ نہیں آتے۔ اس لیے قدرت اپنے پورے جوبن پر جلوہ آرا ہے، زیادہ ہوٹل اور دکانیں بن گئیں تو ناران جیسی حالت ہو سکتی ہے۔ فطری چادر میں لپٹے خپلو میں طاری ہونے والی کیفیت نے مخمور کر دیا تھا۔ یہاں زیادہ دنوں کے لیے آنا چاہیے تھا۔ ہم عصر کے وقت پہنچے تھے۔ بھتیجے تبسم شبیر کے نمائندے حبیب اللہ سے ہمارا موبائل کے ذریعے رابطہ مسلسل جاری تھا۔ خپلو پہنچنے کے بعد اس نے ہمیں گیاری ہوٹل پر چائے پینے کا مشورہ دیا۔ ہم وہاں پہنچے۔ چائے اور پکوڑوں کی فرمائش کی۔ صاف ستھرا اور اچھے معیار کا ہوٹل تھا۔ کمرے کا کرایہ پوچھا تو پانچ ہزار اور دس ہزار بتایا گیا۔ دریا کے کنارے آباد تھا۔ ہمارا سرکاری مہمان خانے میں قیام تھا ورنہ شاید ادھر ہی ٹھہر جاتے۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر حبیب اللہ کے بتائے ہوئے ہسپتال چوک کی تلاش میں نکلے۔ جہاں وہ ہمارا منتظر تھا۔ خپلو بازار کی سڑکیں بہت تنگ اور اچانک موڑوں والی اونچی نیچی تھیں۔ لگتا ہے پہلے یہ گلیاں تھیں، جنھیں بعد میں پختہ کر کے سڑک بنا دیا گیا۔ آگے سے گاڑی آ جائے تو دو گاڑیاں گزرنے میں خاصی مشکل ہوتی ہے۔ ہسپتال روڈ پر حبیب اللہ اپنی موٹر بائیک کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہاں سے وہ اپنی رہ نمائی میں پہلے خپلو فورٹ لے کر گیا۔

خپلو کا قلعہ بھی شگر کے قلعے کی طرح سرینا ہوٹل بن چکا ہے۔ یہاں داخلے کا جرمانہ چار سو روپے فی فرد ہے۔ ہم، حبیب اللہ سمیت پانچ افراد بنتے تھے، نہ جانے حبیب اللہ نے اپنا کیا تعارف کروایا۔ انھوں نے ہمیں مفت میں اندر جانے دیا۔ یوں دو ہزار کی بچت پر دل بہت مطمئن ہوا۔

میرے خیال میں خپلو فورٹ بلتستان کا حسین ترین قلعہ ہے۔ یہ یبگو راجا دولت علی خان نے اپنی دولت کا سہارا لے کر 1840ء میں تعمیر کروایا تھا۔ قلعے کی عمارت میں ایرانی اور بلتی طرزِ تعمیر ملتا ہے۔ یبگو خاندان نے خپلو کے علاقے میں سات سو سال سے زیادہ حکم رانی کی ہے۔ قلعہ تین منزلہ ہے۔ راجا اور اس کے خاندان کے زیر استعمال رہنے والے برتن، ورزش گاہ، باورچی خانہ، مہمان خانہ، محافظوں کی قیام گاہ اور ملبوسات سے سجایا قلعہ اب عجائب گھر بنا ہوا تھا۔ سب سے خوب صورت اور سجی ہوئی منزل اوپر کی تھی جہاں عام سیاحوں کا بھی داخلہ ممنوع تھا۔ یہ صرف وی آئی پی مہمانوں کے لیے کھلتی تھی مگر بھلا ہو حبیب اللہ کا کہ اس نے ہمیں وہاں وی آئی پی بنا کر وہاں کے مناظر بھی دکھا دیے۔ یہاں کچھ کمرے سرینا ہوٹل نے اپنے خاص مہمانوں کے لیے مختص کیے ہوئے ہیں جو یہاں کم از کم بتیس ہزار روپے کے عوض رات بسر کرتے ہیں۔ باقی کمروں میں بھی راجا کے اہلِ خانہ کے استعمال میں رہنے والا فرنیچر اور

اشیائے ضرورپہ بہت خوب صورتی سے سجائی گئی ہیں، ایک دیوان خانہ ہے جہاں نیچے قیمتی قالین بچھا ہے اور اس کے اوپر بستر اور گاؤ تکیے پڑے ہیں اس دیوان خانے کی کھڑکیاں باغات کی جانب کھلتی ہیں۔ یہاں سے پاس بہتے ہوئے نالے کا شور، باغ میں طرح طرح کے درختوں کی مہک اور ہریالی، پرندوں کی چہکاریں اور تمام ماحول دیومالائی داستانوں جیسا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نرم گدوں پر نشست اندوز ہوا تو لگا کہ راجا کی روح میرے اندر سرایت کر گئی ہے۔ کوشش تھی کہ وقت یہیں تھم جائے اور میں سچ مچ راجا بن جاؤں۔

کاش میں اس علاقے کا راجا ہوتا تو سوئٹزرلینڈ کی طرز کی ایک ٹرین اسکردو سے خپلو تک چلاتا۔ اس حسین ٹرین میں سیاحوں کی دل چسپی کا سب سامان موجود ہوتا۔ جگہ جگہ قدرت کی لطیف بانھوں میں بنے اسٹیشن ہوتے۔ پورے علاقے کے مکانات اور ہوٹلوں کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے مطابق تعمیر کراتا۔ کوئی عمارت ایک دوسرے سے جڑی نہ ہوتی۔ سڑک کے ایک طرف ہی عمارتیں ہوتیں۔ دریا کی جانب والا کنارا اکھلا ہوتا۔ میں اس علاقے کی دنیا بھر میں شہرت کرا دیتا، سیاحت اس علاقے کی سب سے بڑی صنعت بن جاتی۔ میرے پیارے پاکستان کے اس دل کش اور حسین گوشے کا نام ہر لب پر آجاتا، سب لوگ یورپ کو بھول جاتے۔ ایسا آتا کاش! میں اس خوب صورت ماحول کو اپنے ساتھ ہی لے جاسکتا۔ اس قلمے میں ہم نے ہر مقام کی ویڈیو اور تصاویر بنائیں۔

قلعے سے نکلنے کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا مگر نکل کر جانا پڑا۔ اب حبیب اللہ کا بائیک ’چھچن مسجد‘ کی طرف جانے والے راستوں پر دوڑ رہا تھا۔ گوری اس کا پیچھا کر رہی تھی، چھوٹی چھوٹی کھیتیوں اور بہتے پانیوں کے ساتھ ساتھ سڑک پر یہ سفر طے ہو رہا تھا۔ چھچن مسجد اس علاقے کی بہت قدیم مسجد ہے۔ اس کی تعمیر کو ساڑھے چھے سو سال سے بھی زیادہ عرصہ بیت چکا ہے۔ یہ مسجد 1370 میں بنی تھی۔ اس کی تعمیر میں لکڑی کا استعمال بہت زیادہ ہوا ہے۔ یہ چھوٹا سا انتہائی خوب صورت تاریخی ورثہ ہے۔ مسجد کی سیڑھیوں پر دو بوڑھے فقیر بیٹھے تھے۔ مسجد ایک چبوترے پر بنی ہوئی ہے۔ جوتے اتار کر اندر داخل ہوئے۔ احمد ندیم بھائی نے مسجد میں نوافل ادا کیے۔ ایک آٹھ دس سال کی بچی مسجد کی صفائی کا کام کر رہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی، مسجد کے لیے کچھ نذرانہ نکالیں۔ میں نے کہا اس مسجد کے لیے دل کا نذرانہ پیش ہے۔ میں

سیاچن کا محاذ کچھ ہی فاصلے پر تھا

نے کچھ پیسے وہاں رکھے لوہے کے صندوق میں ڈالے تو بچی کہنے لگی کہ وہ مسجد کی خدمت کرتی ہے، اسے بھی کچھ دیا جائے۔ وہیں پر مجھے ایک بورڈ نظر آ گیا جس پر لکھا ہوا پڑھا: مسجد کے لیے نذرانہ کسی بھی بچے یا مانگنے والے کو مت دیں، بلکہ خود لو سے کے باکس میں ڈالیں۔“ میں نے بچی کو اسی وجہ سے پیسے نہیں دیے البتہ فقیروں کی کچھ مدد کر دی۔ مسجد سے باہر نکلے تو مغرب ہونے کو تھوڑا ہی وقت بچا تھا۔

سیلنگ وادی، خپلو

یہاں پر ایک اور مقام بھی ہے ’تھوکسی کھر‘ وہاں کا بھی نظارہ کیا جاتا جو پہاڑ کی ایک چوٹی پر بنی ایک اور تاریخی مسجد تھی۔ وہ بہت بلندی پر بنی ایک شان دار مسجد ہے۔ یہاں سے پوری وادیِ خپلو کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ یوٹیوب پر میں کبھی وہاں کی ویڈیوز دیکھ چکا تھا۔ لیکن عین وقت پر میرے ذہن سے نکل گیا کہ یہ خپلو میں موجود ہے۔ باقی کسی کو بھی پتا نہیں تھا۔ حتیٰ کہ وہاں کے ہمارے گائیڈ حبیب اللہ نے بھی نہ جانے کیوں اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اس نے ہمیں ’مشہ بروم ویو پوائنٹ‘ کا تو بتایا مگر تھوکسی کھر کا ذکر ہی نہیں کیا۔ واپس آ کر شہزاد قیصر (شعبۂ اردو) نے مجھ سے پوچھا کہ وہاں گئے تھے۔ تب مجھے بہت افسوس ہوا کہ اس دل کش مقام کو دیکھنے سے ہم محروم رہ گئے۔

چھچن مسجد سے نکلے تو حبیب اللہ ہمیں ’مشہ بروم ویو پوائنٹ‘ لے کر چل پڑا۔ راستے میں اس نے ایک ریسٹورنٹ کے پاس اپنی موٹر سائیکل کھڑی کی اور ہمارا شریکِ سفر بن گیا۔ وہاں سے کچھ ہی کلومیٹر پر ایک نیا اور ایک پرانا پل نظر آئے، یہ وادیِ سیلنگ کی طرف جانے کے راستے کھولتے ہیں۔ پرانا پل ایک معلق پُل تھا۔ چوں کہ اس کی طوالت بہت زیادہ تھی اس لیے اس پر گاڑی بہت بری طرح پُل کے اوپر جھولتی تھی۔ لوگوں کا کلیجا منھ کو آتا تھا۔ اس لیے اب یہاں نیا پُل بنا دیا گیا ہے۔ اس پُل سے ذرا آگے گئے تو دریا کے کنارے، سڑک پر دو تین جوڑے ٹہلتے پائے، معلوم ہوا کہ آگے آرمی کا ایک چھوٹا سا کیمپ ہے جس میں یہ افسر اپنے وطن کی حفاظت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ آرمی چیک پوسٹ پر پہنچے تو انھوں نے پوچھا کہاں جا رہے ہیں، ہم نے مشہ بروم ویو پوائنٹ کا بتایا تو بولے اب مغرب کا وقت ہے۔ آپ آگے نہیں جاسکتے۔ ان سے اپنا تعارف کروایا اور کہا ہمارا تعلق بھی ایک طرح سے آرمی سے ہے۔ جلد لوٹ آنے کے وعدے پر ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر مشہ بروم ویو پوائنٹ بنا ہوا تھا جہاں سے مشہ بروم کی سفید برفانی پیراہن میں ملبوس مشہ بروم عیسائی عروسہ بنی کھڑی تھی۔ وہاں کچھ دیر رکے اور پھر واپس آگئے۔ ہمیں اپنے وعدے کا پاس تھا اس لیے جلد واپسی کا سفر شروع ہوا۔ یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر سیاچن کا محاذ قائم ہے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے دو ہونہار شاگرد شیر از علی اور عمار اس محاذ پر تعینات ہیں۔ ہم نے ان کی اور پاکستان کی حفاظت کی دعائیں کیں۔ شیراز جو کہ اب ڈاکٹر بن چکا ہے، بہت اچھا شاعر بھی ہے۔

واپس آئے تو اندھیرا پھیل چکا تھا اور سیلنگ کی طرف جانے کا وقت نہیں بچا تھا اس لیے وہاں جانے کا ارادہ بدلنا پڑا۔ جاتے ہوئے جس ریسٹورنٹ پر حبیب اللہ نے اپنا موٹر سائیکل کھڑا کیا تھا اسی میں ہم نے کھانا کھانے کا پروگرام بنایا۔ یہ گاہے گاہے ریسٹورنٹ اور ہوٹل تھا۔ بہت خوب صورتی سے تعمیر کیا گیا تھا۔ باہر لان میں بیٹھنے کا انتظام بھی تھا اور اندر حجروں میں بیٹھنے کا بندوبست بھی، ہم نے یاک کے گوشت کی کڑاہی اور دال ماش منگوانے کا ارادہ کیا۔ سعد و فہد کا ارادہ چائنیز کھانے کا تھا۔ اس لیے منچورین اور ایک فرائیڈ رائس بھی منگوا لیے گئے۔ حبیب اللہ کی طرف سے ٹراؤٹ مچھلی بھی فرائی کروائی گئی۔ یہ مچھلی وہ خود لے کر آیا تھا۔ کھانے کی تیاری میں ابھی وقت تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد کھانا آیا تو ہر ایک پکوان اتنا مزے دار تھا کہ ہم تعریف کیے بغیر رہ نہیں سکے۔ اس ہوٹل کے لیے ایک خاص وی لاگ الگ سے بنایا گیا۔ کھانے کے بعد سبز چائے سے تواضع کی گئی۔ کھانے کا جو بل منگوایا تو صرف تینتیس سو روپے تھا۔ یہ اتنے مزے دار کھانے کا انتہائی کم بل تھا۔ معلوم ہوا، ہم نے چوں کہ ان کے کھانے کی تعریف کی اور وی لاگ بنایا تھا اس لیے انھوں نے ہمیں خاص رعایت دی، قہوہ اعزازی طور پر پلایا گیا۔ ہم نے بہت سے شکریے ادا کیے اور حبیب اللہ کی رہ نمائی میں گیسٹ روم کی طرف چل دیے۔

یہ رات جہاں ہم نے گزاری وہ بھی ایک سرکاری مہمان خانہ تھا، صفائی اور دیکھ بھال کے لحاظ سے بلتورو گیسٹ ہاؤس سے چند اں مختلف نہیں تھا۔ باہر لان میں سب اہلِ خانہ سے فون پر متحرک تصویری رابطہ کیا۔ انھیں مہمان خانہ دکھایا۔ پھر کچھ دیر ہی بعد ہمیں سردی نے مجبور کیا کہ ہم کمرے میں جا کر بستر میں گھس جائیں۔ یوں ایک اور یادگار دن کا اختتام ہوا۔ (جاری ہے)

میرے عظیم والد۔ قاضی سراج الدین سرہندی

”ہر باپ عظیم لائق تعظیم کے سلسلے میں سینئر صحافی۔ درد مند پاکستانی قاضی جمیل اطہر نے بھی توجہ فرمائی اور اپنے نامور والد قاضی سراج الدین سرہندی کی جدو جہد۔ ہجرت کی بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ میں قیام۔ ہم وطنوں کی خدمت۔ مختلف کاروبار شروع کرنے کی کوششیں۔ ایک باپ کی تمنّا اور آرزو یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کرے۔ زمانے کی اونچ نیچ سمجھائے۔ کسی کا محتاج نہ ہونے دے۔ ہم شکر گزار ہیں۔ قاضی جمیل اطہر کے کہ انہوں نے صرف اپنے والد کی داستان حیات نہیں۔ بلکہ اس مملکت خداداد کی اپنی بقا کے لیے تگ و دو کی رُوداد قلمبند کی ہے۔ یہ ’اطراف‘ کے آزادی نمبر کے لیے ایک گرانقدر تحفہ ہے۔“

قاضی سراج الدین سرہندی۔ اخبار کے اسرار و رموز سے مجھے آگاہ کرنے والے

روزنامہ جرأت۔ روزنامہ تجارت کے مدیر۔ اے پی این ایس۔ سی پی این ای کے رہنما قاضی جمیل اطہر کی دل میں اترتی تحریر

آج جس شخصیت کا ذکر نوکِ قلم پر آرہا ہے وہ ہیں میرے والد گرامی قدر قاضی سراج الدین سرہندی مرحوم و مغفور۔ میں آج جس مقام پر ہوں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے بعد اس کا ذریعہ میرے والد مرحوم ہی بنے اور میری زندگی پر سب سے زیادہ جس ہستی نے اپنے اثرات ثبت کئے وہ میرے والد مرحوم ہی ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مجھ میں اگر کوئی وصف اور ہنر ہے تو وہ میں نے اپنے والد سے حاصل کیا ہے اور میرے اندر جو خرابیاں اور نقائص ہیں وہ میری اپنی پیدا کردہ ہیں اور ان کا ذمہ دار بھی میں ہی ہوں۔ میرے والد سرہند شریف (مشرقی پنجاب) کے ایک تاجر خاندان میں قاضی محمد اصغر سرہندی کے ہاں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی چلے گئے جہاں سے

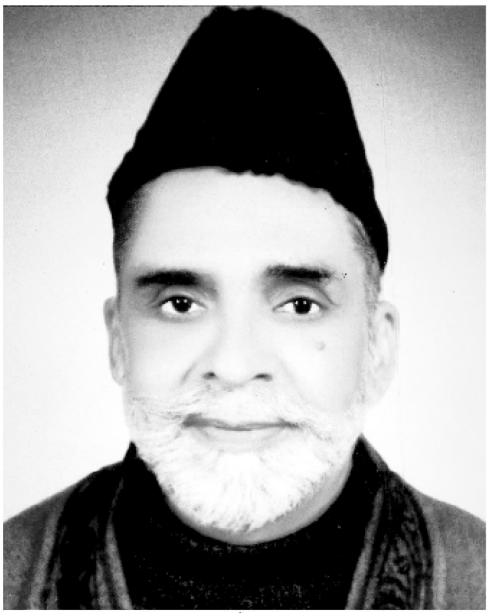

والد صاحب نے حلال روزی کے لیے بہت سے کاروبار اپنائے

انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ وہ میٹرک کا امتحان پاس کرنے والے سرہند کے پہلے طالب علم تھے۔ دہلی میں قیام اور تعلیم نے ان کی شخصیت کو بہت نکھار دیا۔ وہ جمعیت علمائے ہند کے رہنماؤں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، حکیم محمد اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری کی مجالس میں شریک رہے اور دہلی کی تہذیب میں اس طرح رچ بس گئے۔ کہ وہ خود کہا کرتے تھے کہ اگر دہلی میں کسی گھر کے دروازے پر کال بیل بجائی جائے تو صاحب خانہ اس وقت تک گھر کی دہلیز پر تشریف نہیں لائیں گے اور دروازہ نہیں کھولیں گے جب تک وہ اپنی شیروانی پہن کر اس کے پورے بٹن بند نہ کر چکے ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ عمر بھر جب بھی دہلی یا لکھنؤ کا کوئی شخص ان سے ملتا تو وہ ابتدائی گفتگو میں ہی یہ استفسار ضرور کرتا کہ کیا آپ دہلی کے رہنے والے ہیں یا یوپی کے؟ والد صاحب جب تعلیم حاصل کر کے واپس سرہند آئے تو میرے دادا نے جو اس وقت ایک کاٹن جننگ فیکٹری کے مالک تھے، والد صاحب کی ڈیوٹی فیکٹری میں سب سے کم تر کام آٹا چکی پر لگا دی۔ والد صاحب اچکن پہن کر گئے تھے اور شام تک آٹا تولتے تولتے ان کی اچکن کا رنگ بھی آٹے کی طرح ہی ہو گیا، انہوں نے ہمارے خاندان کے ایک بزرگ حاجی محمد صدیق صاحب مرحوم سے شکایت کی کہ والد صاحب نے مجھے کس کام پر مامور کر دیا ہے۔ ہمارے دادا بہت ضدی مزاج کے تھے اور ان سے کوئی بات منوانا آسان نہیں تھا مگر ہمارے یہ بزرگ جو فیصلہ صادر کر دیتے تھے میرے دادا اس پر سر تسلیم ضرور خم کر دیتے تھے۔ سو آٹا چکی سے والد صاحب کی ڈیوٹی ختم ہوئی اور ہمارے بزرگ نے ایک دکان کی چابیاں والد صاحب کے حوالے کیں، انہیں دکان کی جھاڑ پونچھ کرانے کو کہا اور خود ایک ہندو تاجر کی دکان پر گئے اور وہاں سے سوجی اور میدے کی چند بوریاں دکان پر بھجوا دیں۔ شب بارات قریب تھی، انہوں نے والد صاحب سے کہا کہ جب یہ سوجی میدہ بک جائے تو اتنی رقم فلاں لالہ جی کو دے آنا۔ یہ سوجی میدہ چند روز ہی میں فروخت ہو گیا اور والد صاحب لالہ جی کو ان کی رقم بھی ادا کر آئے مگر سوجی میدہ کا کام بھی ان کے معیار پر پورا نہ اترا اور انہوں نے

میرے عظیم والد۔قاضی سراج الدین سرہندی

اپنی دکان کو منیاری کے کاروبار کے لئے وقف کر دیا۔ انبالہ گئے، وہاں سے جنرل مرچنٹس کا کچھ سامان خریدا اور دکان پر توجہ دینا شروع کی۔ دکان کے دو حصے تھے، ایک میں وہ خود بیٹھتے تھے اور دوسرے میں ذخیرہ کیا ہوا سامان رکھا جاتا تھا۔ والد صاحب کی نگاہ شروع سے ہی بہت تیز تھی اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی نگاہ رکھتے تھے۔ ایک بار انہوں نے ملازم کو گاہک کے لئے سامان لانے دوسرے حصہ میں بھیجا تو اس نے سامان لانے میں کچھ دیر کر دی، والد صاحب نے آواز دی تو وہ جلدی میں اپنی قمیص کے بٹن بند کرنا بھول گیا، والد صاحب نے اس پر نگاہ دوڑائی تو محسوس کیا کہ اس نے قمیص کے اندر تین چار نئی بنیانیں پہنی ہوئی ہیں اور جلدی میں بٹن بند نہ کرنے کے باعث اس کی چوری پکڑی گئی۔ اس طرح ایک دوسرا ملازم گھر سے کھانے کے لئے جو ٹفن کیریئر لاتا تھا، کھانے کے وقفے میں کھانا کھانے کے لئے کچھ زیادہ ہی وقت صرف کرتا تھا، ایک روز دکان بند کرتے ہوئے والد صاحب نے اس کے ٹفن کیریئر کی تلاشی لی تو اس میں نصف درجن بنیانیں اور اتنے ہی انڈرویئر چھپائے گئے تھے۔ والد صاحب نے اپنا کاروبار سنبھالتے ہی تعلیمی، رفاہی اور سیاسی کاموں کی طرف توجہ دینا شروع کی۔ وہ سرہند میں لاہور اور دہلی کے کئی اخبارات کے نامہ نگار بن گئے۔ انہوں نے دوسرے لوگوں کی مدد سے سرہند شہر میں مسلم سکول کے نام سے پہلے تعلیمی ادارے کی داغ بیل ڈالی، پھر وہ پرجا منڈل کے نام سے ایک سیاسی جماعت سے وابستہ ہو گئے ؛ ممتاز صحافی جناب محمود شام کے والد حکیم صوفی شیر محمد ریاست پٹیالہ میں پرجا منڈل کے صدر اور والد صاحب اس کے جنرل سیکرٹری تھے۔ سرہند منڈی جو ریلوے سٹیشن سرہند کے قریب واقع آبادی کا نام ہے، میں ہمارا خاندان واحد مسلمان خاندان تھا۔ ہمارے دادا نے پاکستان بننے سے کچھ ہی سال پہلے اپنی فیکٹری میں لوہے کی سلاخیں بنانے کا ایک پلانٹ بھی لگایا تھا۔ میرے تایا قاضی محمد صغیر الدین کریانے کی دکان کرتے تھے، میرے دوسرے تایا قاضی نصیر الدین میرے والد کے کاروبار میں شریک ہو گئے تھے۔ میرے ایک چچا قاضی علاء الدین لکڑی اور فرنیچر کا کاروبار کرتے تھے اور علامہ مشرقی کی خاکسار جماعت سے وابستہ تھے۔ ایک اور چچا قاضی ظہور الدین کپڑے کی دکان کرتے تھے اور سرہند مسلم لیگ کے سیکرٹری تھے۔ سب سے چھوٹے چچا قاضی عمر دین دادا مرحوم کی فیکٹری میں آٹا چکی پر وہ ذمہ داری ادا کرنے کے لئے مامور کئے گئے جسے والد صاحب نے اٹھانے سے معذرت چاہی تھی۔ ہمارا سارا خاندان امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی درگاہ کا خدمت گار رہا۔ درگاہ کے جتنے بھی خلیفہ مقرر کئے گئے اُن مجلسوں میں والد صاحب فیصلہ کُن حیثیت سے شریک ہوتے رہے۔ جب پاکستان بننے کا مرحلہ آیا تو والد صاحب نے میری والدہ اور ہم دو بھائیوں کو ہمارے ننھیال پٹیالہ بھیج دیا جہاں ہمارے نانا بابو مہر علی پٹیالہ پولیس میں سب انسپکٹر تھے۔ والد صاحب نے ہندو مسلم فسادات کے سائے گہرے ہوتے دیکھ کر یہ اقدام اس لئے کیا تھا کہ ہم اپنے نانا کے پاس زیادہ محفوظ ہوں گے مگر ہوا اس سے اُلٹ! ہمارا سارا خاندان فسادات کی بُو سُونگھ کر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی درگاہ میں منتقل ہو گیا اور سرہند شہر، سرہند سبی اور نواحی دیہات کے ہزاروں مسلمان پناہ لینے کے لئے روضہ شریف چلے آئے۔ ادھر ہم ایک ایسے شہر میں تھے جہاں کے سکھ مہاراجہ جھو پندر سنگھ نے اپنی فوج کو مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑنے کے لئے کھلی چھُوٹ دے دی تھی۔ ہم اپنے نانا کے گھر کھلے صحن میں کھیل رہے تھے، ہماری نانی آٹا گوندھنے میں مصروف تھیں کہ اچانک ہمارے نانا اور ہمارے ماموں شیخ غلام حسین جو پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھے، خلافِ معمول گھر پہنچے اور انہوں نے ہمیں فی الفور یہاں سے باہر نکل آنے کا حکم دے دیا۔ نانی اماں کے ہاتھ آٹے سے لت پت تھے، والدہ نے ہم تین بھائیوں کو اپنے ساتھ گھسیٹا اور ہم اپنے نانا کی حویلی سے باہر سڑک پر آ گئے۔ ہمیں کچھ معلوم نہ تھا کہ ہماری اگلی منزل کہاں ہے اور ایک چھ سات سالہ بچے کو آنے والے حوادث کا علم بھی کیسے ہو سکتا تھا۔ ہم کچھ فاصلہ طے کر کے ایک اور حویلی میں پہنچے جہاں گولیاں چلنے کی آوازیں فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ ہم نے تو اسے کھیل تماشہ ہی تصور کیا مگر جلد ہی پتہ چلا کہ سکھ ایک قریبی محلے میں پہنچ گئے ہیں اور جلد ہی اس حویلی پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اچانک سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک گولی میری خالہ کو آن لگی اور وہ خون میں لت پت ہو گئیں، ان کی مرہم پٹی کی گئی، اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ کوئی آپریشن ہوا نہ وہ گولی نکالی گئی اور ساری عمر خالہ نے اس گولی کے ساتھ ہی بسر کی۔ خطرہ بھانپ کر ہمارے نانا اور ماموں نے اس حویلی سے کسی اور محفوظ جگہ چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم ایک اور جگہ پہنچ گئے اور ابھی جا کر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ پھر ایک شور و غوغا بلند ہوا اور یہ خبریں آنے لگیں کہ یہ جگہ بھی اب محفوظ نہیں رہی۔ اس گھر میں بھی سیکڑوں عورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے پناہ لئے ہوئے تھے۔ نواحی آبادیوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ سکھ اپنی کرپائیں لہرا رہے تھے اور مسلمانوں کو تہس نہس کرنے کے لئے للکار رہے تھے۔ اب ہماری منزل کوئی اور محلہ تھا۔ اب مجھے ان گلی محلوں کے نام تو یاد نہیں ہیں لیکن دکھائی یہ دے رہا تھا کہ موت ہمارا پیچھا کر رہی ہے، ہم اس کے آگے ہیں اور وہ پیچھے۔ ایک مکان میں قدرے سکون تھا لیکن حویلی کا مالک چیختا چلّا تا آیا اور اس نے کہا کہ سکھ تلواریں لئے اس گھر پر حملہ کرنے والے ہیں اور قبل اس کے کہ وہ آئیں اور عورتوں کو اغواء کر لیں، عورتیں صحن میں بجلی کی تار کو ہاتھ لگا کر اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دیں۔ ہماری والدہ بھی ہمیں لے کر صحن کی طرف جا رہی تھیں کہ ان کی نظر پانی کے ایک نل پر پڑی انہوں نے سوچا کہ مرنے سے پہلے بچوں کو پانی تو پلا دوں لیکن وہ ابھی نل کے قریب ہی پہنچ پائی تھیں کہ ہمارے ماموں کی نظر ہم پر پڑی اور وہ ہمیں گھسیٹتے اور کھینچتے ہوئے اس حویلی سے باہر لے گئے۔

میرے والد صاحب کا تعلق اگرچہ ایک ایسے خاندان سے تھا جس کی دلچسپی کا زیادہ تر مرکز کاروبار تھا مگر یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ میرے دادا اور ان کے بڑے بھائی اور ان کی اولاد صرف کاروبار سے ہی سروکار رکھتے تھے مگر میرے والد، میرے تایا اور چچا اپنے اپنے کاروباری مشاغل میں مصروفیت کے باوجود کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے بھی تعلق استوار کئے ہوئے تھے البتہ پاکستان بننے کے بعد میرے والد اور ان کے دیگر بھائیوں نے سیاست سے تعلق توڑ لیا۔ صرف میرے تایا قاضی نصیر الدین سرہندی جماعت اسلامی سے وابستہ رہے۔

بلدیاتی سیاست میں سرگرم۔کئی بار منتخب ہوئے

میرے والد کو سرہند شریف سے ٹوبہ ٹیک سنگھ آنے کے بعد مہاجرین کی آبادکاری کے مسائل سے بہت دلچسپی رہی اور آبادکاری کے حکام نے لوٹ کھسوٹ کا جو بازار گرم کر رکھا تھا، انہیں بہت ناگوار گزرتا تھا۔ ان کی پہلی غیر سیاسی سرگرمی یہ تھی کہ انہوں نے انجمن مہاجرین کے نام سے ایک غیر سیاسی جماعت تشکیل دی جس کا کام مہاجرین کی مشکلات دُور کرنا، انہیں قانونی رہنمائی مہیا کرنا اور محکمہ آبادکاری کے حکام کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھنا تھا۔ انجمن مہاجرین کی داغ بیل ڈالنے کا مہاجرین کو کوئی فائدہ ہوا یا نہیں لیکن والد صاحب کو یہ نقصان ضرور ہوا کہ انہیں سرہند میں چھوڑی ہوئی اپنی جائیداد کے عوض کوئی دکان الاٹ ہوئی اور نہ کوئی مکان ملا بلکہ میرے جن چچا صاحب کو مین بازار میں ایک دکان الاٹ بھی ہو گئی تھی انہیں بھی اس کی سزا ملی اور ڈپٹی ری ہیبلی ٹیشن آفیسر نے وہ دکان ہمارے دو اور عزیزوں کو الاٹ کر دی جس کا نہ صرف چچا صاحب کو نقصان ہوا بلکہ ہمارے اور ہمارے قریبی عزیزوں کے درمیان نہ ختم ہونے والی دُوری بھی پیدا ہو گئی مگر والد صاحب نے نتائج کی کوئی پروا نہ کی اور رشوت ستانی کے واقعات کے خلاف جدوجہد جاری رکھی، اس مقصد کے لئے وہ لاہور کے روزنامہ ''مہاجر'' لائل پور کے روزنامہ ''انصاف'' اور پھر لائل پور ہی کے روزنامہ ''غریب'' کے ساتھ بطور نامہ نگار وابستہ ہوئے۔ ان اخبارات میں بھی ان کی تحریروں کا مقصد و محور مہاجرین کے مسائل ہی رہا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں چونکہ مہاجرین کی بڑی تعداد سرہند شریف سے آ کر آباد ہوئی تھی، اس لئے ہمارے گھر میں ہر وقت مہاجر مردوں اور عورتوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ہماری بیٹھک کے باہر سیکڑوں لوگوں کے جُوتے پڑے رہتے تھے جو والد صاحب سے ملاقات اور ہمدردی کے انتظار میں اپنے کئی کئی گھنٹے ہمارے گھر میں بسر کرتے تھے۔ والد صاحب ٹوبہ ٹیک سنگھ میونسپل کمیٹی کے برسوں نامزد اور پھر منتخب کونسلر اور وائس پریذیڈنٹ بھی رہے۔ وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے انہوں نے شورکوٹ بازار کے نام سے ایک نیا بازار آباد کیا اور اس بازار میں ریلوے سٹیشن کو جانے والے راستہ پر کونے کی ایک دکان بھی خود حاصل کی مگر یہاں کوئی کاروبار کرنے کے بجائے انہوں نے ایک سبیل بنا دی اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے

نام پر اس کا نام رکھا۔ ''مجددیہ سبیل''۔ یہ سبیل ان کے انتقال کے 44 سال بعد بھی سبیل کے طور پر ہی جاری ہے۔ اگر چہ والد صاحب کو اور ان کی رحلت کے بعد ہمیں بھی اس دکان کے عوض کافی مالی پیشکشیں ہوتی رہیں مگر ہم نے والد صاحب کی رُوح کو خوش کرنے کے لئے یہاں مسافروں کو پانی پلانے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ ہمارے خاندان بالخصوص میرے دادا اور والد صاحب رفاہی کاموں میں پانی پلانے کو بہت اہمیت دیتے تھے، سرہند شریف میں بھی جب حضرت مجدد الف ثانیؒ کا عرس ہوتا تھا تو ہمارے خاندان کے افراد روضہ شریف کے صدر دروازے پر زائرین کو پانی پلانے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ انہوں نے سرہند ریلوے سٹیشن پر اور قیام پاکستان کے بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ ریلوے سٹیشن پر پانی کی سبیلیں لگانے کا بھی اہتمام کیا ہوا تھا۔ والد صاحب نے بطور وائس پریذیڈنٹ ایک نئی بستی آباد کرنے کا بھی منصوبہ بنایا۔ یہ منصوبہ ان لوگوں کے لئے تھا جو بے آباد رہے تھے اور جنہیں ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانات الاٹ نہیں ہو سکے تھے۔ والد صاحب نے اس بستی کا نام ''سرہند بستی'' رکھا اور اسی طرح یہاں جو جامع مسجد تعمیر ہوئی اس کو ''مجددیہ مسجد'' کا نام دیا۔ یہ سرہند اور حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ان کی لازوال وابستگی کی چھوٹی چھوٹی مثالیں ہیں۔ والد صاحب انجمن مہاجرین کے پلیٹ فارم سے مہاجرین کی مشکلات اجاگر کرنے کے لئے اکثر غلہ منڈی میں جلسے منعقد کرتے تھے۔ میری عمر اگر چہ ابھی کم ہی تھی مگر سٹیج سیکرٹری کے فرائض میں انجام دیتا تھا۔ والد صاحب کی یہ آرزو جو کبھی پوری نہیں ہو سکی کہ میں ان جلسوں میں ترنم سے نظمیں بھی پڑھا کروں مگر مجھے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ایک مقرر کی حیثیت سے میری تربیت ہوتی رہی۔ اس سلسلے کا آخری جلسہ جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے، وہ تھا جہاں والد صاحب کے دوست محمد رمضان صاحب تقریر کر رہے تھے کہ اچانک یہ آوازیں بلند ہونے لگیں کہ غلہ منڈی سے باہر ملک کریانہ سٹور کی دکان میں آگ لگ گئی ہے۔ یہ سنتے ہی اور کچھ ہی فاصلے پر آگ کے شعلے بلند ہوتے دیکھ کر اور دُھواں آسمان کی طرف بلند ہوتے ہوئے یہ جلسہ کسی اعلان کے بغیر ختم ہو گیا اور ہم سب ملک کریانہ سٹور کی طرف چلے گئے۔ ہر شخص کی کوشش تھی کہ وہ آگ بجھانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار سکے۔ میں بھی ان رضا کاروں میں شامل تھا جو دکان کے اندر جاتے تھے اور کچھ نہ کچھ اٹھا کر باہر سڑک پر لا کر رکھ دیتے تھے۔ میرے والد صاحب کے قریبی ساتھی محمد رمضان بڑی جانفشانی سے یہ فرض ادا کر رہے تھے کہ اچانک مکان کی چھت منہدم ہو گئی اور ملبے تلے کئی لوگ دب گئے اور اس میں محمد رمضان صاحب نے جام شہادت نوش کر لیا۔

میرے والد صاحب نے کئی چھوٹے موٹے کاروبار کئے مگر کامیابی کم ہی ہوئی۔ میرے دادا کو تو گوجرہ میں ایک کاٹن جننگ فیکٹری الاٹ ہو گئی تھی اور ایک خالی پلاٹ شورکوٹ بازار میں مل گیا تھا جہاں انہوں نے خود مشینری خرید کر کاٹن فیکٹری لگائی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی فیکٹری میں میرے چچا قاضی ظہور الدین اور قاضی عمر دین دادا جان کا ہاتھ بٹا رہے تھے، گوجرہ کی کاٹن فیکٹری میں ہمارے دادا خود جاتے تھے اور ہر جمعرات کی شام گوجرہ سے واپس ٹوبہ آ جاتے تھے اور پھر ہفتے کے روز گاڑی سے گوجرہ چلے جاتے تھے۔ والد صاحب نے ابتدا میں کنفیکشنری کی ایک مشین لگائی جس پر وہ خود کاریگر کے طور پر بچوں کے لئے گولیاں ٹافیاں بناتے تھے۔ پھر انہوں نے کپڑا بنانے کی دیسی کھڈیاں لگائیں جن پر خواتین کے ملبوسات کے لئے ریشمی کپڑا تیار ہوتا تھا، پھر انہوں نے ایک ہوزری فیکٹری لگائی جس میں بنیانیں اور انڈرویئر تیار ہوتے تھے۔ پھر سوت گولہ کا ایک پلانٹ لگایا اور اتوار کی چھٹی کے روز سوت گولہ کے آرڈر بک کرنے کے لئے مجھے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے باہر بھیجنے لگے۔ میں کبھی شورکوٹ روڈ جاتا، کبھی شورکوٹ شہر، کبھی عبدالحکیم، کبھی مخدوم پور پہوڑاں کبھی کمالیہ اور پیر محل اور کبھی تاندلیانوالہ، ماموں کانجن اور جڑانوالہ۔ میں بازاروں میں دکان دکان گھوم کر اپنی مصنوعات متعارف کراتا، آرڈر بک کرتا، کچھ رقوم پیشگی لیتا اور پھر یہ سامان اگلے ہفتے تک دکانوں پر خود پہنچاتا۔ کپڑا بنانے کی دیسی کھڈیوں پر خام مال کے طور پر جو ریشمی دھاگہ استعمال ہوتا تھا، بعض اوقات وہ لائل پور مارکیٹ سے ملتا نہیں تھا، اس مقصد کے لئے والد صاحب چھٹی کے روز مجھے اپنے ایک دوست سیٹھ محمد رشید کے پاس سکھر بھیج دیتے تھے، میں وہاں سے وہ ریشمی دھاگہ لے کر اگلے روز واپس ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچتا۔ کبھی کبھی والد صاحب مجھے میرے پھوپھا شیخ ثناء اللہ صدیقی کے پاس لالہ موسیٰ بھیجتے، وہ مجھے وہاں سے ریشمی دھاگہ دلاتے جو لے کر میں واپس آتا۔ والد صاحب نے ایک دو اخبارات کی ایجنسیاں بھی لے لی تھیں، ان میں روز نامہ ''غریب'' لائل پور بھی شامل تھا جو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس وقت سب سے زیادہ فروخت ہوتا تھا۔ ہماری کاٹن فیکٹری کے باہر بابا شہاب الدین کو جو دن بھر راہ گیروں کو پانی پلانے کا فرض انجام دیتے تھے صبح کے وقت یہ اخبارات فروخت کرنے پر مامور کر دیا گیا۔ ایک روز یہ اطلاع ملی کہ بابا شہاب الدین بیمار ہیں اور آج اخبار فروخت نہیں کر سکیں گے۔ والد صاحب نے مجھے طلب کیا اور کچھ لوگوں کی ایک فہرست میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ کل صبح تم ریلوے سٹیشن پر جاؤ گے، وہاں سے اخبار کا بنڈل وصول کرو گے اور ان لوگوں کے گھروں میں اخبار ڈال کر آؤ گے۔ میں نے کچھ پس و پیش سے کام لیا۔ میرے ابا جی نے کہا تمہیں پتہ ہے وہ گاڑی سورج نکلنے سے پہلے آ جاتی ہے، تم جن گھروں میں اخبار دے کر آؤ گے وہاں کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کون اخبار ڈال گیا ہے۔ خیر میں نے اس کام کی حامی بھر لی۔ ریلوے سٹیشن پر صبح لائل پور سے آنے والی پہلی گاڑی سے اخبار کا بنڈل حاصل کیا اور والد صاحب کی دی ہوئی فہرست کے مطابق اخبارات تقسیم کر دیئے لیکن میری آزمائش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کیونکہ بابا جی بدستور بیمار تھے۔ ان کے بیٹے حامد نے یہ اطلاع دی کہ وہ کل بھی نہیں آ سکیں گے، تب والد صاحب نے مجھے کہا کہ آج بیس اخبار بچ گئے تھے، کل لوگوں کے گھروں پر اخبار پہنچانے کے ساتھ ساتھ بازار میں آواز لگا کر یہ اخبار فروخت بھی کرنا ہیں۔ میں نے پھر کچھ تامل ظاہر کیا مگر والد صاحب کے اصرار پر ہتھیار ڈال دیئے اور شہر کے مرکزی چوک میں آواز لگائی..... آ گیا تازہ غریب اخبار..... لوگ مجھ سے اخبار خریدنے لگے مگر اچانک ہی میں نے دیکھا کہ میرے والد صاحب کے دوست اور شہر کے ایک بڑے تاجر چوہدری فضل کریم نے مجھے دیکھ لیا ہے، وہ میرے قریب آئے، مجھ سے اخبار لیا اور پھر مجھ پر یہ فقرہ اُچھالا کہ کیا قاضی سراج کا دیوالیہ نکل گیا ہے کہ ان کا بیٹا اخبار بیچ رہا ہے۔ میں تو خاموش رہا مگر میں ان کے جاتے ہی اخبار بغل میں لپیٹ کر واپس اپنے گھر جا پہنچا جہاں والد صاحب نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا کتنے اخبار بک گئے اور کتنے باقی ہیں۔ میں نے ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنی پیتا سنائی کہ چوہدری فضل کریم نے میری بہت توہین کی ہے اور مجھے بُرا بھلا کہا ہے، ابا جی نے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ایک دن آئے گا جب چوہدری فضل کریم کو تمہاری ضرورت پڑے گی، مجھے کچھ سمجھ نہ آیا چوہدری فضل کریم کو میری کیا ضرورت پڑے گی۔ پھر والد صاحب نے پوچھا کتنے اخبار بچ گئے ہیں۔ میں نے کہا دس، انہوں نے کہا دوبارہ بازار جاؤ اور یہ فروخت کر کے آؤ۔ ان کے حکم پر بازار چلا گیا اور اخبار بیچنے لگا، اس طرح اخبار کے بچوں کے صفحہ میں لکھنے لگا۔ پھر والد صاحب ڈاک خانہ میں ڈالنے کے لئے خبروں کا جو لفافہ میرے حوالے کرتے تھے میں اس میں کسی نہ کسی فٹ بال میچ کی خبر ڈال دیتا تھا۔ جب میری بھیجی ہوئی اس طرح کی پہلی خبر شائع ہوئی تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور والد صاحب کو بھی میں نے فخر سے خبریں دکھانا شروع کیں۔ پھر میں خود اخبار کا نامہ نگار بن گیا۔ بلدیہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے انتخابات ہونے والے تھے۔ ایک وارڈ میں چوہدری فضل کریم بھی امیدوار تھے جنہوں نے مجھے اخبار بیچنے پر طنز کا نشانہ بنایا تھا۔ میں نے ان کے حلقۂ انتخاب کے جائزہ میں یہ لکھا کہ چوہدری فضل کریم کے مدمقابل کی پوزیشن مضبوط ہے اور چوہدری صاحب کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ انہوں نے یہ اخبار پڑھا اور ہمارے گھر آن پہنچے اور والد صاحب سے شکایت کرنے لگے کہ آپ کے بیٹے نے میرے بارے میں یہ لکھا ہے۔ والد صاحب نے یاد دلایا کہ دراصل میرا بیٹا آپ سے ناراض ہے، آپ نے فلاں وقت اس پر ایک جملہ کسا تھا، وہ بار بار وضاحت کرنے لگے کہ مجھے ایسا کوئی واقعہ یاد نہیں لیکن ساتھ ساتھ میرے گھٹنے بھی چُھو رہے تھے اور مجھے اپنا بھتیجا قرار دے کر معافی بھی مانگ رہے تھے۔ والد صاحب نے مجھے کہا کہ چوہدری

روزنامہ 'وفاق' کے لیے میں نے اور مصطفیٰ صادق صاحب نے قرضے لیے۔ وقت پر ادا نہ کر سکے

میرے عظیم والد۔قاضی سراج الدین سرہندی

صاحب اب کیونکہ خود چل کر آئے ہیں اس لئے میں تم سے یہ تو نہیں کہتا کہ آج سے تم ان کی حمایت شروع کر دو لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ آج کے بعد ان کے خلاف کوئی خبر نہ بھیجنا۔ چوہدری صاحب یہ سُن کر اطمینان سے چلے گئے مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ ابا جی نے مجھے کیا کہا ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ ذرا پھر سمجھائیں کہ آپ نے مجھے کیا ہدایت کی ہے۔ والد صاحب نے کہا میں نے تمہیں یہ کہا ہے کہ میں یہ نہیں کہوں گا کہ آج سے تم ان کی حمایت کرنا شروع کر دو، اس لئے کہ تم یہ لکھ چکے ہو کہ ان کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ اگر تم ان کی حمایت میں کل یہ لکھ دو گے کہ ان کی کامیابی کا امکان پیدا ہو گیا ہے یا امکان بڑھ گیا ہے تو تمہارے لکھے کا کوئی اعتبار نہیں کرے گا۔ لوگ کہیں گے کہ کل اس نے یہ لکھا تھا اور آج یہ لکھ رہا ہے، لازماً اس نے کوئی فائدہ اٹھالیا ہے۔ میں نے تم سے یہ کہا ہے کہ ان کی مخالفت میں کوئی خبر نہ بھیجنا۔ اگر تم خاموش رہو گے، ان کے خلاف کوئی خبر نہیں بھیجو گے تو تمہیں کوئی پوچھنے نہیں آئے گا کہ تم نے تو دس دن پہلے یہ خبر دی تھی، اس دن کے بعد اس بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس طرح چوہدری فضل کریم مطمئن ہو جائیں گے اور تمہارے لکھے کا اعتبار بھی برقرار رہے گا۔ اخبار میں حکمت کس چیز کا نام ہوتا ہے، یہ پہلا سبق تھا جو اخبار بیچنے کے بعد اخبار کا نمائندہ بن کر میں نے اپنے والد صاحب کی زبان سے سُنا اور سیکھا۔ انہوں نے مجھ سے اخبار فروخت کرائے اور اس اخبار فروشی کے باعث میں آج کئی اخبارات کا ایڈیٹر ہوں اور تین بار اخباری مدیروں کی جماعت (سی پی این ای) کا صدر رہ چکا ہوں۔ اگر میرے والد صاحب نے مجھ سے یہ کام نہ لیا ہوتا تو شاید میں آج بھی ان کی ہوزری فیکٹری اور سُوت دھاگے کے آرڈر ہی بُک کر رہا ہوتا۔

والد صاحب کی وصیت: کوئی یتیم بچہ تعلیم حاصل کرنا چاہے تو اسے تعلیم دلانا

میرے والد صاحب کو کھدر کا لباس پہننا بہت مرغوب رہا، پاکستان بننے کے بعد جب وہ مجھے ساتھ لے کر سرہند شریف گئے تو مجھے ''کھدر بھنڈار'' کے نام سے کانگریس کی کھولی ہوئی دُکان پر لے گئے اور قمیص شلوار کے لئے کھدر خریدا اور پاکستان واپس آ کر مجھے سلوا کر دیا۔ میں ایک روز سخت گرمی میں کھدر کے کپڑے پہنے سکول سے گھر آیا تو وہاں میرے چچا قاضی علاؤ الدین سرہندی کے برادر نسبتی مسعود احمد جو لائل پور میں رہتے تھے، والد صاحب کے پاس تشریف فرما تھے، مجھے کھدر پہنے دیکھ کر والد صاحب سے مخاطب ہوئے، بھائی جان یہ دولت آپ کے کس کام آئے گی، آپ نے بچے کو اتنے سخت گرم موسم میں کھدر کے کپڑے پہنا رکھے ہیں۔ والد صاحب نے میری طرف دیکھے بغیر جو پسینے سے شرابور تھا، مسعود صاحب سے کہا مسعود! میں انہیں ایک خاص مقصد سے یہ لباس پہناتا ہوں، اگر انہیں آنے والی زندگی میں ریشمی کپڑے پہننے کو نہ ملے تو یہ چوری نہیں کریں گے اور دوسرے غلط کام نہیں کریں گے، یہ کھدر پہنتے رہیں گے اور یہ انہیں چبھے گا نہیں اور تکلیف نہیں دے گا۔ کھدر پہننے کے میلان کا ہی نتیجہ تھا کہ میں ابھی میٹرک کا طالب علم ہی تھا کہ میں نے خان عبدالغفار خان کی تحریک ''سرخ پوش'' اور مولانا ظفر علی خان کی تحریک ''نیلی پوش کی طرز پر'' تحریک کھدر پوش'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کا مقصد عوام کو کھدر پہننے اور ملک میں تیار کردہ مصنوعات استعمال کرنے کے لئے آمادہ کرنا تھا۔ اس تحریک کا پہلا جلسہ کمالیہ کے صدر بازار چوک میں منعقد کیا گیا جس کا اہتمام وہاں کے ایک سماجی کارکن اور ہمارے ہم خیال دوست صدیق احمد کمالوی نے کیا تھا جن کی صدر بازار میں کریانہ اور پنساری کی دکان تھی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر ضروری ہے کہ جب میں کمالیہ جانے کے لئے اپنے گھر سے نکلنے لگا تو میری والدہ نے جنہیں کچھ علم نہیں تھا کہ میں کس مقصد سے کمالیہ جا رہا ہوں سردی کی شدت کے باعث اوڑھنے کے لئے ایک گرم چادر مجھے دے دی۔ میرے ایک ہم سفر ساتھی نے بس میں بیٹھ کر مجھے بتایا کہ یہ گرم چادر جاپان کی بنی ہوئی ہے اس لئے جلسہ میں شرکت سے قبل اور بس سے اترتے ہوئے میں یہ چادر اس کے حوالے کر دوں تا کہ تحریک کھدر پوش کے مقاصد کے حوالے سے سامعین میں سے کوئی اس پر اعتراض نہ کر سکے۔

والد صاحب کا کاروبار پاکستان آنے کے بعد کئی نشیب و فراز سے گزرا، انہوں نے دستی کھڈیاں لگائیں۔ ان پر سُوتی اور ریشمی کپڑا تیار کرا کر لائل پور میں فروخت کے لئے بھیجا۔ پھر ہوزری کا کام شروع کیا مگر یہ بھی نہ چلا۔ پھر میرے دادا نے انہیں سمندری روڈ گوجرہ پر واقع اپنی کاٹن جننگ فیکٹری میں بھیج دیا جہاں وہ اپنے تایا زاد بھائی قاضی محمد صادق کے ساتھ مل کر کاٹن جننگ فیکٹری چلاتے رہے جس میں تین حصہ دار شیخ محمد افضل بانسانوالہ بازار لاہور میرے بڑے دادا حاجی محمد اکبر اور میرے دادا قاضی محمد اصغر مساوی حصہ دار تھے میرے دادا کے انتقال کے بعد میرے والد صاحب اس فیکٹری میں اپنے والد کی نمائندگی کرتے رہے مگر یہ کاروبار بھی زوال کا شکار ہو گیا۔ والد صاحب نے کافی عرصہ اپنے گھر کی بیٹھک میں کپڑے کی دُکان کی۔ پھر میرے تایا قاضی نصیر الدین صاحب جو ڈیرہ غازی خان چلے گئے تھے اور پھر ڈیرہ غازی خان سے کراچی جا کر وہاں بندر روڈ پر نیو کلاتھ مارکیٹ میں کپڑے کا کاروبار شروع کیا تھا وہ واپس ٹوبہ ٹیک سنگھ آ گئے۔ والد صاحب اور تایا جی سرہند شریف میں بھی جنرل مرچنٹس کی دُکان مشترکہ طور پر کرتے تھے، جب تایا جی کراچی سے ٹوبہ آئے تو والد صاحب نے انہیں اپنے کپڑے اور ہوزری کے کاروبار میں شریک کر لیا، کئی سال کے بعد یہ کاروبار بھی خسارے کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس وجہ سے والد صاحب لائل پور چلے آئے۔ سات روزہ ''وفاق'' اور روزنامہ ''وفاق'' کے اکاؤنٹس کا کام سنبھالا مگر وفاق کے مالی حالات بھی دگرگوں رہے، تب مولانا عبدالرحیم اشرف نے انہیں اشرف لیبارٹریز میں بُلا لیا، اس دوران میرا چھوٹا بھائی معراج ظفر بھی ان کے ساتھ رہا۔ پھر انہوں نے اشرف لیبارٹریز کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ میرے چچا (والد صاحب کے تایا زاد بھائی) قاضی محمد عبداللہ اور قاضی عبدالرحیم نے انہیں جڑانوالہ بُلا لیا، جہاں انہوں نے ایک فلور ملز ٹھیکے پر لے رکھی تھی۔ میرے چچا صاحبان نے ان کی بہت قدر و منزلت کی۔ وہ ہر بات میں ان سے مشورہ کرتے اور ان کی ہدایات اور مشوروں پر عمل بھی کرتے، میری مرحومہ چچی صاحبہ بھی ان کا بہت خیال رکھتیں، وضو کے لئے سردی میں پانی گرم کر کے دیتیں۔ والد صاحب کو ہمیشہ گرم چپاتی مرغوب رہی، میری چچی خاص طور پر اہتمام کرتیں کہ انہیں کھانے کے وقت توے سے تازہ گرم گرم روٹی ملتی رہے، میری والدہ محترمہ نے بھی ہمیشہ میرے والد صاحب کا ان پہلوؤں سے بہت خیال رکھا، گرم روٹی کے ساتھ انہیں ٹھنڈا پانی بھی بہت پسند تھا۔

والد صاحب نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں قیام کے دوران بلدیاتی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ وہ کئی بار میونسپل کمشنر اور کونسلر منتخب ہوئے، وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میونسپل کمیٹی کے وائس پریذیڈنٹ بھی رہے، اس وقت چوہدری عبدالغفور (الہلال ویجی ٹیبل گھی ملز ملتان کے میاں عبدالستار سابق ممبر قومی اسمبلی کے بڑے بھائی) میونسپل کمیٹی کے پریذیڈنٹ تھے۔ ایک دوبارہ وہ الیکشن ہارے بھی جب ان کے اپنے ہی قریبی ساتھی ان کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور وہ ان کے حامی ووٹروں کا کچھ حصہ توڑنے میں کامیاب رہے۔

جب ہم نے روزنامہ وفاق کا اجراء کیا تو مصطفی صادق صاحب اور میں نے اپنے احباب اور عزیز و اقارب سے کچھ رقوم قرض لیں مگر ابتدائی ماہ و سال میں ادارہ وفاق مالی مشکلات سے دوچار رہا اور جن لوگوں سے یہ رقوم لی گئیں تھیں وعدے کے مطابق وہ ادا نہ ہو سکیں۔ والد صاحب نے بھی اپنے بھائیوں سے کچھ رقوم جلد ادائیگی کے وعدے پر لے کر دی تھیں جن کی وعدہ کے مطابق ادائیگی نہیں ہو رہی تھی۔ والد صاحب کو اسی وجہ سے مصطفی صادق صاحب اور مجھ سے شکایت رہتی تھی۔ 1964ء میں عید الاضحیٰ آ رہی تھی اور مجھے یہ فکر لاحق تھی کہ بر وقت ادائیگی نہ ہونے کے باعث والد صاحب مجھ سے خفا ہوں گے۔ میرا معمول تھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے آنے کے بعد میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے موقع پر اپنے والدین سے ملنے ضرور جاتا تھا لیکن قرض لی گئی رقم ادا نہ ہونے کے باعث میں شرمندگی سے دوچار تھا اس لئے میں ٹوبہ ٹیک سنگھ نہ گیا۔ والد صاحب نے مجھے ایک خط لکھا جس میں وہ فرماتے ہیں، برخوردار! طول عمرہ، خط آپ کا ملا تحریر کردہ حالات معلوم ہوئے ہم سب کی ہر وقت یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے کاروبار میں دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور آپ اس قابل ہو جائیں کہ والدین اولاد کی طرف سے عائد شدہ فرائض سے سبکدوش ہو سکیں۔ والدین کو اولاد سے بہت کچھ توقعات وابستہ رکھنی پڑتی ہیں خواہ وہ عمر بھر پُوری نہ ہوں آپ نے جب کسی مرحلہ پر کسی ضرورت کا اظہار کیا خدا کا شکر ہے

کہ والدین کی ادنیٰ سے کوشش سے وہ ضرورت پُوری ہوتی رہی۔ آپ کی والدہ نے بھی آپ کو اپنی ضروریات کے لئے کبھی مایوس نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اب آپ کے لئے قرض کا بوجھ بھی سر پر اٹھایا محض اسی لئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے کاروبار میں اطمینان عطا فرمادے اگرچہ گزشتہ حالات کا تقاضا واضح تھا کہ وعدہ پُورا کرنا آپ لوگوں کے بس کا روگ نہیں تھا کبھی بھی کوئی وعدہ ایفانہ ہوا مگر یہ جان کر کہ مجبوری کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے ہمیشہ زبانی بھی اور تحریری بھی یہی تاکید کی کہ اپنے وعدے کی قدر کرو۔ لیکن جُوں جُوں وقت گزرتا گیا اندازہ ہوا کہ اس بات کو کوئی وزن نہیں دیا گیا دوسروں کی رقوم میرے لئے پہاڑ جیسا بوجھ معلوم ہو رہی ہیں۔ میں ان لوگوں کے سامنے ہمیشہ کے لئے دب کر رہ گیا ہوں پھر وہ کتنے لوگوں کے پاس ہماری عہد شکنی کا تذکرہ کریں گے۔ کتنے لوگوں کے ہاں ہماری بدنامی ہوگی اور پھر اس کے نتائج کیا ہوں گے، میری ساکھ کو اس قدر نقصان پہنچا ہے کہ اس کا ازالہ ناممکن ہو گیا ہے آپ نے لائل پور میں وعدہ کیا تھا کہ جاتے ہی دونوں قرض خواہوں کی رقم کا نصف نصف بھیج دوں گا افسوس یہ ہو اکہ کوئی خط لکھنا تو دُور کی بات ہے آپ عید پر گھر بھی نہیں آئے، دوسری طرف آپ حضرات کے بے جا اخراجات کی نشاندہی کرنا زیادہ مناسب نہیں نہ مجھے یہ حق پہنچتا ہے کہ ایسے اخراجات شمار کراؤں جو میری نظر میں قطعی غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں، چونکہ اس کا فائدہ اور نقصان آپ لوگوں کا ہی ہے والدین تو ہر حالت میں ہمیشہ اولاد کی بھلائی کے طلب گار ہوتے ہیں اور انشاء اللہ ہماری طرف سے آئندہ بھی اس میں کوئی کمی نہیں آئے گی لیکن برخوردار آپ کے لئے ہزاروں تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ اب بھی یہی عرض کروں گا کہ اخراجات اپنے بس میں ہوتے ہیں، آمدن بڑھانا اپنے بس کی بات نہیں۔ خواہ گھر کا معاملہ ہو یا کاروبار کا۔

روزنامہ 'تجارت' کا اداریہ وہ لکھتے تھے۔
پریس وہ سنبھالتے تھے

ایک اور خط میں لکھتے ہیں! بہت دیر سے تمہارا کوئی خط مجھے نہیں ملا۔ غالباً جس روز سے مل کر ٹوبے سے گئے ہو تم نے کوئی خط نہیں لکھا بہتر اور اچھا طریقہ یہی ہے کہ گاہے بہ گاہے والدین کو خط لکھتے رہا کرو، زندگی میں والدین کی تمنا رہتی ہے کہ اولاد ان کو یاد کرتی رہے بعد از حیات تو سبھی یاد کرتے ہیں ماں باپ کے لئے اولاد بڑی نعمت ہے اور اولاد کے لئے ماں باپ کا سایہ بے حد رحمت ہے۔ دکان کے مقدمے کے سلسلے میں خلاف فیصلہ ہو جانے سے مجھے جو صدمہ ہوا ہے اس کا ذکر کرنا تو مناسب نہ تھا چونکہ مصطفیٰ صادق صاحب کی زبانی پتہ چلا کہ آپ کو اس کا خود بھی احساس ہے یہ صدمہ بڑی حد تک ایک حادثہ ہے جو ساٹھ سالہ زندگی میں اس قدر نقصان کے ساتھ گزرا ہے، لیکن سوائے صبر کے کوئی چارہ ہے اور نہ کوئی علاج مگر صبر ہی ہے کہ آتا نہیں رات کو جس وقت آنکھ کھُل جاتی ہے تمام واقعات فلم کی طرح سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات سخت پریشان ہو جاتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے آگے دست بدعا ہوتا ہوں کہ اے اللہ اس صدمے میں صبر کی توفیق دینے والا بھی تُو ہی ہے اور آئندہ اس کے ازالہ کی بھی توقع تجھی سے ہے۔ ہر نماز میں اولاد کے لئے خوش حالی کی دعا کے ساتھ ساتھ آپ لوگوں کے اس کاروبار کی ترقی اور کامیابی کے لئے بھی دعائیں کرتا ہوں کہ اے اللہ مجھے کسی ایک کی طرف سے ہی مطمئن کر دے کہ ہاں ان کا کاروبار خوش حالی سے چلنے لگا ہے۔ مقدمہ کے اس فیصلہ کے بعد ارادہ تھا کہ ٹوبہ میں ہی کوئی کاروبار کروں اور لائل پور چھوڑ دوں مگر کوئی امید کی کرن دکھائی نہیں دیتی حاجی محمد صدیق صاحب سے کئی دفعہ گفتگو ہوئی وہ یہی کہتے ہیں کہ تم لائل پور چھوڑ کر واپس ٹوبہ آجاؤ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن کسی سہارے اور آسرے کے بغیر کیسے چھوڑ کر بیٹھ جاؤں حالات کا تقاضا تو یہ ہے کہ اب مزید محنت اور جدوجہد سے اپنی جان کو دکھ دے کر بھی زیادہ کام کروں تا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دن بدل دے اگر ممکن ہو تو حاجی محمد صدیق صاحب کو خط لکھیں کہ وہ جس طرح بھی چاہیں ہم بھائیوں کے مابین کاروبار کے مسئلہ طے کر دیں تا کہ میں وہاں کوئی کام کر سکوں اور زندگی کے باقی ایام کچھ آرام سے گزر جائیں۔

میں نے والد صاحب کے اس خط کی تعمیل میں 19 نومبر 1962ء کو اپنے بزرگ حاجی محمد صدیق صاحب کو والد صاحب کے خط کی روشنی میں حالات سے آگاہ کیا انہوں نے جواب میں لکھا تمہارا خط آنے سے قبل ہی میرا ارادہ تھا کہ تمہیں کچھ لکھوں مگر کوتاہ قلمی کے باعث نہ لکھ سکا بھائی صاحب کے متعلق جو خیال آپ نے ظاہر کیا ہے میری اپنی رائے یہ ہے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ متاثر ہیں۔ میں تم دونوں بھائیوں سے وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ آپ دونوں اپنے گھر کے اخراجات کا بندوبست کریں تا کہ بھائی صاحب پر کسی قسم کا بوجھ نہ رہے ان سے کہہ دیں کہ آپ بس بے فکری سے زندگی گزاریں آپ کو معاش کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہئے امید ہے کہ آپ میری اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے مجھے ہاں یا نہیں میں جواب دیں گے۔ میں نے بھی بھائی صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ آپ لائل پور سے تو بہ آجائیں کارخانے میں اپنی نشست گاہ رکھ کر شہر اور خاندان کی خدمت کریں بعد میں دیکھا جائے گا کہ معاش کا کیا بندوبست ہوتا ہے۔ کارخانے کی زمین کے متعلق آپ اپنا مشورہ دیں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے کیونکہ میں اپنی پوری طاقت صرف کر چکا ہوں عقل زیادہ رکھنے والے کسی دوسرے کی بات پر اعتماد نہیں کرتے۔

حاجی محمد صدیق کے خط کی روشنی میں میں نے والد صاحب کو پھر ایک خط لکھا اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو اس کی جزا عطاء فرمائے کہ آپ نے صدمات سے زخمی والد کی اپنے خط کے الفاظ سے ڈھارس بندھانے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان چیزوں سے راضی ہوتا ہے۔ میری حالت یہ ہے کہ زندگی کے دن کم ہوتے جارہے ہیں اور تفکرات ہیں کہ روز بروز بڑھتے جارہے ہیں۔ کوئی بھی کام پایہ تکمیل کو پہنچتے میں نہیں آتا۔ زندگی کے قیمتی پانچ سال دکان کے مقدمہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش میں گزر گئے ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے اس آزمائش کے لئے مجھے کیوں موزوں جانا اب صبر و شکر کی توفیق بھی وہی دینے والا ہے میری طبیعت بے حد کمزور ہوگئی ہے کوئی بھی نا خوش گوار بات برداشت نہیں ہوتی ہر وقت اس فکر میں مبتلا ہوں کہ خداوند قدوس جلد کوئی سبب بنا دے تا کہ لائل پور چھوڑ دوں کیونکہ یہ کسی طرح بھی مجھے راس نہیں آرہا میری طبیعت اب یہاں نہیں لگتی۔ جی چاہتا ہے کہ جلد کوئی اسباب ایسے ہو جائیں جس سے میں گھر چلا جاؤں جس امید میں یہ پانچ سالہ طویل وقت یہاں گزار آخر کار یہ ختم ہو گیا اب کوئی منزل نہیں ہے جس کے سہارے یہاں بیٹھا رہوں۔ اخبار کے ڈیکلریشن کے بارے میں اطلاع ملی کہ اب حافظ صاحب سے مصطفیٰ صادق صاحب کو منتقل ہو گیا ہے مبارک ہو۔ اللہ مزید کامیابیوں سے نوازے۔ اب تک کی کامیابیاں مصطفیٰ صادق صاحب کی محنتوں اور کوششوں کا نتیجہ ہیں قرض خواہوں کا تقاضا میری طبیعت پر بے حد بوجھ کا باعث بن رہا ہے اس لئے اس معاملے کو سرِ دست خیال نہ کریں۔ میری کوشش تھی کہ ان تقاضوں پر کچھ دن اور گزر جائیں اس لئے اس خط کے ذریعے پھر یاد دہانی کرانی پڑ رہی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو یہ رقم بھیج دیں کیونکہ تقاضے برداشت کرنے کی طاقت اب مجھ میں نہیں ہے اور نہ تمہاری والدہ اسے برداشت کر سکتی ہے اس لئے فکر کر کے اس ادائیگی کا قصہ اب ختم کر دو اپنے کام کی طرف پوری طرح متوجہ رہو انشاء اللہ کامیاب ہو گے تمہاری والدہ اور میری دعائیں شامل حال رہیں گی۔ مصطفیٰ صادق صاحب کا ہر حالت میں احترام کرنا ضروری خیال کرو۔ اس میں فائدہ ہے اور یہی کامیابی کی راہ ہے کاروبار میں برکت بھی اسی میں مضمر ہے برداشت ضرورت سے زیادہ کرو۔ اخلاق کو جس قدر بھی وزن دو گے زندگی کی منزلیں سر کرنے میں بے حد معاون ثابت ہوگا۔ مہمان نوازی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کامیابی اور کامرانی کے لئے گزرنے والے لوگوں سے جس قدر بھی خوبیاں حاصل کر سکو کرو۔ ان کا نہ صرف سرسری مطالعہ کرو بلکہ دل میں جگہ دے کر اپنانے کی سعی کرو غریبوں اور مسکینوں سے محبت اور اخلاص سے پیش آنا بھی بہتر راہ عمل ہے بہر حال کچھ الفاظ یونہی لکھ گیا ہوں ورنہ آپ جیسے فہم و فراست کے حامل کے لئے ان کی ضرورت نہیں تھی اگر ممکن ہو تو اپنی والدہ کی دل جوئی کے لئے ہر ماہ کچھ نہ کچھ ضرور بھجوا دیا کرو۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں کل تمہارا ایک قرض خواہ میرے پاس آیا۔ مجھے جو ندامت اٹھانا پڑی وہ میں ہی جانتا ہوں ابھی تو مقام شکر ہے کہ ایسے آدمی نہیں جو مجھے گردن سے پکڑ لیں میں نے ان سے

ایک ماہ کا وعدہ کرلیا ہے۔ برخوردار، میری اس تحریر کو معمولی بات نہ خیال کرنا میری عزت آبرو اور ساکھ کا سوال ہے۔ میں نے یہ بُرے دن کبھی نہ دیکھے تھے۔ اس لئے مجبوری کی وجہ سے یہ الفاظ لکھ رہا ہوں۔ میرے ان الفاظ کو پورا کرنا تمہاری ذمہ داری ہے دوسرے مجھے اپنے صحیح صحیح حالات لکھوتا کہ میں آپ کی پریشانی میں کمی کے لئے کچھ سوچوں ایک ماہ میں ایک مرتبہ والدین کو ملنے ضرور آجایا کرو۔ خواہ ایک رات کے لئے آؤ ماں باپ کی طبیعت اور شفقت کچھ ایسی چیز ہے کہ کچھ نہ بھی بتاؤ تو صبر نہیں آتا۔ اس لئے ضرور آکر مل جایا کرو۔ اگر زیادہ وقت نہیں تو ایک گھنٹہ کے لئے ہی آجایا کرو۔ اپنے اخراجات پر کڑی نظر رکھو۔ امید پر اخراجات بڑھالینا ہرگز دانش مندی نہیں آپ لوگوں کے حالات کا اگر چہ مجھے پورا علم نہیں تو اندازہ ضرور ہوتا رہتا ہے مگر آپ نے اخفا رکھنا ہی مصلحت جانا یا والدین کو اپنے حالات کی پریشانی سے بچانا مناسب خیال کیا میری دعا ہے خداوند قدوس مجھے اپنی بارگاہ سے اتنا دے کہ میں یہ سارے حوادث برداشت کرسکوں۔ میرے دماغ پر ان باتوں کا اس قدر بھاری وزن پڑ گیا ہے کہ الفاظ میں بیان کرنا آپ لوگوں کے لئے مزید پریشانی کا باعث ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ قرض خواہوں کی پریشانی سے مجھے جلد نجات دلا دو گے ابھی بے شمار مدداریاں مجھے آپ کے اوپر ڈالنا ہیں۔

والد صاحب نے اپنی رحلت سے کچھ عرصہ پہلے ایک روز مجھے اپنے پاس بیٹھنے کے لئے کہا اور میرے بیٹھتے ہی کسی تمہید کے بغیر فرمانے لگے میں نے اپنی زندگی میں دولت کا آنا بھی دیکھا ہے اور اس کا جانا بھی، جب اللہ تعالیٰ نے مجھے دولت عطا کی تو مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اسے خرچ کہاں کروں اور جب اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ دولت واپس لے لی تو مجھے کچھ سمجھائی نہیں دیتا تھا کہ میں اسے دوبارہ کیسے حاصل کروں۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو دولت عطا کرے تو اس کے استعمال کے سلسلے میں کچھ باتیں تمہیں کہنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہارے علم میں اپنے محلے، اپنے رشتے داروں اور اپنے جاننے والوں میں کوئی ایسا یتیم بچہ ہو جو تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہو مگر اسے وسائل میسر نہ ہوں تو اسے تعلیم دلانا۔ اسی طرح اگر تمہیں اپنے محلے اور اپنے رشتے داروں اور اپنے جاننے والوں میں کسی ایسی خاتون کا علم ہو جو بیوہ ہو اور زندگی گزارنے کے وسائل سے محروم ہو تو تم اس کی خدمت کرنا اور اگر اپنے محلے، اپنے رشتے داروں اور اپنے جاننے والوں میں کوئی بے آباد بچی تمہارے علم میں آئے تو اس کی خدمت کرنا۔ پھر مجھ سے دریافت کیا کہ بے آباد بچی سے کیا مراد ہے کیا تم سمجھتے ہو؟ میں نے نفی میں جواب دیا تو فرمانے لگے کہ بے آباد بچیاں وہ ہوتی ہیں جن کے خاوند لاتعلقی اختیار کرلیتے ہیں اور وہ والدین اور بہن بھائیوں کے پاس واپس آجاتی ہیں اور پھر وہ بھی ایسی بچیوں کو بوجھ تصور کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد میری ایک قریبی عزیزہ کا نام لے کر کہنے لگے کہ اس کے متعلق میں خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں۔ ان کی بات سُن کر میں نے فوراً ہی کہا کیا میں اسے تین سو روپے ماہوار بھیج دیا کروں۔ والد صاحب نے کہا مجھے تم سے ایسی ہی بے وقوفی کی توقع تھی۔ انسان کسی کی باتیں سنتا ہے اور بغیر سوچے سمجھے اپنی استطاعت سے بڑھ کر وعدے کرلیتا ہے۔ ایک دو مہینے پیسے بھیجتا ہے اس کے بعد پیشانی پر بل آنا شروع ہوجاتے ہیں کہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ ایسے تین سو روپے دینے سے جو دل کی ناخوشی کے ساتھ دیئے جائیں، سو روپے دینا بہتر ہے کہ آدمی باقاعدگی سے بھیجتا بھی رہے اور اس پر کسی طرح کی پریشانی بھی لاحق نہ ہو۔

والد صاحب عمر کے آخری سالوں میں میرے پاس رہے۔ روز نامہ تجارت کے لئے اداریہ وہی لکھتے تھے پھر جب ہم نے 43 ریٹی کن روڈ پر خواجہ محمد طفیل (مرحوم) ایس پی کرائمز برانچ کی کوٹھی میں تجارت پرنٹرز کے نام سے اپنا پریس لگایا تو انہوں نے ہی پریس کا کام سنبھالا مگر وہ اس کام سے خوش نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کوشش کے باوجود وعدے کے مطابق کام دینے سے قاصر رہتے ہیں باوجود اس کے کہ میں پارٹی سے کام دینے کا وعدہ متعلقہ عملے کے مشورے سے کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود کوئی نہ کوئی مشکل آن پڑتی ہے اور وعدہ پورا نہیں ہوتا۔ پھر ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مجھے پریس لگانے کے بجائے پریس کے لئے کوئی جگہ پہلے تعمیر کرنی چاہئے تھی کیونکہ پورا مہینہ کام کرنے سے پریس میں جو منافع ہوتا ہے وہ عمارت کے کرائے میں چلا جاتا ہے۔ والد صاحب اپنی زندگی کی ابتدا سے ہی صبح اور شام کی سیر کے عادی تھے۔ وہ مجھے بھی اس کی نصیحت کرتے رہتے تھے مگر میں ان کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں کرسکا جس کی سزا مختلف عوارض کی صورت میں اب بھگت بھی رہا ہوں۔ جون 1978ء میں وہ صبح سیر کے لئے گھر کے قریب ہی واقع پارک میں گئے ہوئے تھے جہاں انہیں دل کا عارضہ لاحق ہوا پہلے تو وہ کسی واقف شخص کا انتظار کرتے رہے جو انہیں گھر چھوڑ جائے مگر جب کوئی ایسا شخص دکھائی نہ دیا تو وہ خود چل کر گھر آئے۔ میں ان کے کمرے سے ملحقہ باتھ روم میں نہا رہا تھا کہ میں نے ان کے درد سے کراہنے کی آواز سنی۔ میں باتھ روم سے باہر آیا اور ان سے دریافت کیا، جس پر انہوں نے بتایا کہ انہیں ناقابل برداشت درد ہے اور میں کسی ڈاکٹر کو لے کر آؤں، زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے خود ڈاکٹر کو بلانے کا کہا ورنہ وہ عام طور پر ڈاکٹروں اور ایلوپیتھی ادویات سے گریز ہی کرتے رہے۔ میں دو تین ڈاکٹروں کے پاس گیا مگر صبح کا وقت ہونے کے باعث کوئی ڈاکٹر ہاتھ نہ آیا، گیارہ بجے کے قریب شاہ ابوالمعالی روڈ پر کلینک کرنے والے ڈاکٹر شفیق الرحمان خان، جو شادمان میں رہتے تھے دستیاب ہوئے۔ وہ والد صاحب کی علالت کا سنتے ہی فوراً سمن آباد میں ہمارے گھر پہنچے۔ والد صاحب کا معائنہ کیا اور یہ رائے دی کہ انہیں دل کا شدید دورہ پڑا ہے اور ہم انہیں بلا تاخیر ایمپریس روڈ پر کنعان ٹرسٹ ہسپتال میں ڈاکٹر رؤف یوسف کے پاس لے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں وہ خود چل کر گئے تھے مگر واپسی پر انہیں وہیل چیئر پر لایا گیا اور ڈاکٹر صاحب نے انہیں اپنے ہسپتال میں داخل کرلیا والد صاحب تین چار روز علیل رہے وہ انجکشن لگوانے پر تیار نہیں تھے مگر میرے بزرگ دوست حاجی برکت علی نے بمشکل انہیں اس پر آمادہ کیا۔ ان کے دل کی کئی شریانیں بند ہوچکی تھیں اور خون کا انجماد ہوگیا تھا۔ علالت کے تین چار ایام میں، میں دن رات ان کے ساتھ رہا ایک روز مجھ سے کہنے لگے کہ اگر ایک آدھ دن میں میری طبیعت ٹھیک نہ ہوئی تو مجھے گھر لے جانا۔ میں نے پوچھا گھر سے مراد سمن آباد ہے یا ٹوبہ ٹیک سنگھ والا گھر، کہنے لگے سمن آباد۔ میری والدہ کو جو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تھیں دوسرے روز والد صاحب کی علالت کی اطلاع دی گئی وہ ریل کے ذریعے لاہور ریلوے سٹیشن آئیں وہاں سے ویگن میں بیٹھیں انہیں سمن آباد آنا تھا کہ راستے میں ویگن کو آگ لگ گئی جس سے میری والدہ کا برقعہ جل گیا الحمدللہ وہ خود محفوظ رہیں والدہ کو اپنے برقع کا جلنا ایک بُرا شگون محسوس ہوا اور وہ والد صاحب کے بارے میں اور بھی زیادہ متفکر ہوگئیں۔ علالت کے چوتھے روز مصطفیٰ صادق صاحب اور ارشاد احمد حقانی والد صاحب کی عیادت کے لئے ہسپتال آئے تو مجھے کہا کہ میں چند گھنٹوں کے لئے گھر چلا جاؤں اور کچھ آرام کرلوں۔ میں نے ان کی بات مان لی اور گھر چلا آیا میرے دو دوست حافظ بشیر سہیل اور حاجی محمد اسلم بٹ والد صاحب کے پاس ہی رہے اور میری چھوٹی بہن امیہ بھی وہیں رہیں۔ حافظ صاحب اخبار پڑھ کر انہیں خبریں والد صاحب کو سنا رہے تھے ان میں جنرل محمد ضیاء الحق کا ایک خطاب شامل تھا۔ خبریں سنتے سنتے والد صاحب کی آنکھ لگ گئی چند منٹ بعد وہ ہڑبڑا کر اٹھے اور کہا کہ مجھے سخت گرمی لگ رہی ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ کمرے کا اے سی چل رہا ہے مگر والد صاحب نے کہا کہ میری قمیض اتار دیں لیکن جب قمیض اتارنے پر بھی انہیں قرار نہ آیا تو انہوں نے بنیان بھی اتارنے کے لئے کہا۔ اس دوران ایک دوست ڈاکٹر رؤف یوسف کو لینے چلے گئے مگر ڈاکٹر صاحب کے آنے سے پہلے ہی والد صاحب کی روح قفس عنصری سے پرواز کرچکی تھی۔ 14 جون 1978ء کو ہم ان کی میت لے کر سمن آباد پہنچے اور اسی رات ایمبولینس میں ان کے جسد خاکی کو ٹوبہ ٹیک سنگھ لے گئے اور اگلی صبح ٹوبہ ٹیک سنگھ کے مرکزی قبرستان میں ان کے والد قاضی محمد اصغر سرہندی مرحوم کے پہلو میں انہیں سپرد خاک کردیا گیا۔ ❁

> **والد صاحب نے ہی بتایا**
> **'بے آباد بچیاں' کون ہوتی ہیں**

”اَن کہی کی مصنّفہ۔ غزالہ خالد کی تحریر میں شگفتگی بھی ہے اور طنز کے نشتر بھی۔ ہمیں فخر ہے کہ انہوں نے اپنی تحریر کے لیے ہماری درخواست پر ’اطراف‘ کے صفحات کو انتخاب کیا۔ ان کا اپنا ایک حلقہ قارئین ہے۔ اس میں اب پاکستان اور بیرون پاکستان ’اطراف‘ کے قارئین بھی شامل ہو گئے ہیں۔ حالات بہت تلخ ہیں اور کشیدہ بھی۔ ایسے میں اگر آپ کو کوئی ہلکے پھلکے انداز میں آس پاس کا احساس دلائے تو یہ ایک نفسیاتی راحت کے باوصف ہی ہے۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔“

اگست۔ ”تو کون کہ میں خوامخواہ“ کا مہینہ

تحریر: غزالہ خالد

بچپن میں ایک ضرب المثل سنی تھی کہ

تو کون؟ کہ میں خوامخواہ

سن کر بڑا عجیب لگا تھا کہ ہیں! یہ کیا بات ہوئی بھلا۔

بچپن رخصت ہوا کچھ عقل آئی تب بھی یہ ضرب المثل اکثر یاد آجاتی تھی اور کئی بار کوشش کی کہ کسی صورتحال پر اسے فٹ کر دیں لیکن کبھی مزا نہیں آیا۔

اب اگست کا پورا مہینہ یوم آزادی کے ساتھ ساتھ بہت اہم خبروں کا مہینہ ہونے کے علاوہ تو کون؟ کہ میں خوامخواہ!“ کا مہینہ بھی تھا سب سے پہلے بنگلہ دیش کی صورتحال کو ہی لے لیجئے بنگالی طلباء نے کوٹہ سسٹم کے خلاف ہنگامے شروع کئے جو آخر کار حسینہ واجد کی رخصتی

بنگلہ دیش کے طلبہ کہ۔ ارشد ندیم۔ ہمارے نوجوان مٹھائیاں بانٹنے لگے

پر ختم ہوئے۔ اب اس پوری صورتحال میں ہمارا ”لینا ایک نہ دینا دو“ لیکن ہم feel like اپنا اپنا کرتے رہے۔ ہمارے نوجوان ایسے سینہ چوڑا کر کے گھومے جیسے یہ سب کچھ ان کا ہی کارنامہ ہو کیونکہ ہم بھی کوٹہ سسٹم سے پریشان ہیں اکثر ہمارے طلبہ بھی اس کو ختم کرنے کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ پھر انہیں نیند آجاتی ہے یا کہیں ٹک ٹاک بنانے جانا ہوتا ہے اس لئے بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔ اب جو انہوں نے بنگلہ دیش کے نوجوانوں کی حکومت مخالف تحریک دیکھی اور حسینہ واجد کو بنگلہ دیش سے بھاگتے دیکھا تو

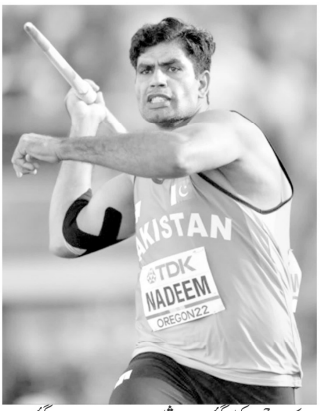

ان کی باچھیں کھل گئیں اور سوشل میڈیا پر مٹھائیاں بٹ گئیں اب ہمیں یہ خیال تو آنا تھا ناں کہ بھئی تم کون؟ کہ میں خوامخواہ“۔

ادھر ارشد ندیم نے نیزہ پھینک دیا اور اتنی دور پھینکا کہ سارے ریکارڈ توڑ ڈالے لوجی بھنگڑے تو ڈلنے ہی تھے کہ چالیس سال بعد گولڈ

برطانیہ میں مسلمانوں کی قبریں توڑی گئیں

میڈل ہمارے ملک میں آرہا تھا اور ہمارے لئے تو 92.97 میٹر دور پھینکا جانے والا نیزہ feel like ہزاروں میٹر“ تھا یعنی ظاہر ہے کہ بہت بڑی بات تھی لیکن حکومت بہت خوش ہوئی حالانکہ اس میں صرف اور صرف ارشد ندیم، اس کے کوچ اور ماں کے ہاتھ کی اصلی گھی سے چپڑی دو روٹیوں کا کمال تھا عوام کی خوشی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن حکومتی حلقوں کے بھنگڑے سمجھ سے باہر تھے! خیر ”وہ“

گئے تو نہیں لیکن سنا تھا کہ استقبال کو" وہ" بھی جائیں گے کیونکہ "سر" کا وژن تھا، اب آپ لوگ خود سمجھ جائیں کہ ہمیں کیا خیال آیا ہوگا؟

ہاں بالکل وہی کہ

تو کون؟ کہ میں خواہ مخواہ!"

سنتے تو یہ بھی آئے ہیں کہ ایک دن زمین تنگ کر دی جائے گی اب

انٹرنیٹ کچھوا کچھوا کیوں ہو رہا ہے

پتہ نہیں سب کے لئے تنگ کر دی جائے گی یا یہ صرف ہم پاکستانیوں کو ہی بھگتنا پڑے گا کیونکہ ہمارے لئے تو یہ عمل ابھی سے شروع ہو چکا ہے انگلینڈ کے حالات ہمارے سامنے ہیں کئی علاقوں کے مسلمان پاکستانی خوف کے مارے اپنے گھروں میں محصور ہیں۔ خبروں کے مطابق مسلمانوں کی قبروں تک پر حملے کئے گئے، قبریں توڑی گئیں اور ان پر رنگ پھینکے گئے۔ سوچنے کا مقام ہے ان لوگوں کے لئے جو انگریزوں سے اتنے متاثر ہیں کہ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو Feel like "گورا صاب" کرتے ہیں۔ ہمیں تشویش تو ہوئی خیال آیا کہ جب امریکہ، آسٹریلیا، انگلینڈ یہاں تک کہ قطر اور سعودی عرب میں بھی حالات خراب ہو جائیں گے تو" پاکستان سے زندہ بھاگ" والی سوچ کا کیا بنے گا؟ ابھی پریشان ہونا شروع ہی کیا تھا کہ دل نے پوچھا تمہیں پاکستان سے بھاگنا تھا کیا؟ ہم نے کہا "نہیں تو" یہ جواب سنتے ہی دماغ بولا پھر سکون سے بیٹھو بیکار میں "تو کون؟ کہ میں خواہ مخواہ!"

ارے اسی بات پر ایک اور بات بھی یاد آ گئی۔ خبروں کے مطابق سعودی عرب، یو اے ای اور عراق نے پاکستانیوں کی اخلاقیات پر پاکستان سے شکایت کی ہے ان کے مطابق یہاں سے جانے والے ورکرز ہر وقت وہاں غصے اور چڑچڑاہٹ کے مظاہرے کرتے ہیں۔ ہمیں اس خبر پر بڑی حیرت ہوئی۔ یو اے ای سے آنے والے کراچی کے ایک مقامی محنت کش سے جب یہ سوال پوچھا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا آستینیں چڑھاتا ہوا بولا کہ" اڑے تھووڑے وہاں کی گورنمنٹ پر! ایسی کی تیسی! ان کی اتی ہمت ہوئی کیسے کہ ہمیں بداخلاق بولتے ہیں ہم نے تھوڑے کہے کو بہت جانا اور اپنے آپ سے یہ کہہ کر کہ

"تو کون؟ کہ میں خواہ مخواہ"

کسی اور پاکستانی سے یہ سوال پوچھنے کا خیال ہی ترک دیا۔

کل ایک صاحب ملے اور بولے اس بار کے" اطراف" میں ذرا "ہم" افراد کی گرفتاریوں کے بارے میں بھی لکھئے گا ہمارا تو دل پتے کی طرح لرز گیا Feel like

"ہارٹ اٹیک" ہوا ہم نے خوف کے مارے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کسی نے سن نہ لیا ہو اور انہیں جواب دیا کہ" بھیا کیا پدی کیا پدی کا شوربہ" خبردار جو آئندہ کبھی ہمیں اتنے نامعقول مشورے سے نوازا۔ ہم تو اگر غائب ہو گئے تو ملیں گے بھی نہیں۔

بے کار میں "تو کون؟ کہ میں خواہ مخواہ" مفت مشورے دیکر چھنوانے آجاتے ہیں۔

آجکل انٹرنیٹ بھی Feel like

"کچھوا کچھوا" ہو رہا ہے کوئی کام کرنے بیٹھو تو اس کی سست رفتاری کی وجہ سے غصہ آنے لگتا ہے۔ اڑتی اڑتی سنی ہے کہ شاید فائروال لگائی جا رہی ہے ہم اردو میڈیم لوگ ہیں اس لئے یہ سنتے ہی ہمارے دماغ میں تو" آگ کی دیوار" ہی آئی خیر تفصیلات سے پتہ چلا کہ یہ سوشل میڈیا پر" آگ کی ایسی دیوار" ہے کہ جس میں" ان" کا تمام

کیا دلوں کے گرد بھی آگ کی دیوار لگے گی

ناپسندیدہ مواد جل کے بھسم ہو جایا کرے گا اور ہم تک وہی پہنچے گا جو" وہ" چاہیں گے یعنی "ہم" جو ابھی تازہ تازہ اترائے بل کھاتے

"یوں دی ہمیں آزادی کہ دنیا ہوئی حیران

اے قائداعظم تیرا احسان ہے احسان"

گا کر اور" یوم آزادی" منا کر فارغ ہی ہوئے تھے ایک پل میں Feel like

"قیدی قیدی" ہو گئے بھئی بس اب قیدی نمبر نہ پوچھیں بس قیدی کہنا ہی کافی ہے یعنی کہ حد ہی ہو گئی اور یہ بھی سنا ہے کہ اس آگ کی دیوار پر اربوں روپیہ لگ رہا ہے اور اس کی تنصیب کے دوران انٹرنیٹ کے کچھوا بن جانے سے انٹرنیٹ کمپنیوں کو چالیس کروڑ ڈالر سے زیادہ کا نقصان بھی ہو رہا ہے۔

یہ سب پڑھکر بس ایویں ہی ہمیں خیال آ گیا کہ "کیا سوچوں پر بھی پابندی ہو گی اور کیا دلوں پر بھی فائروال لگا دیں گے؟"

"نہیں ناں" تو بس یہ خیال آنا تھا کہ ہم ہلکے پھلکے ہو کر Feel like آزاد پنچھی بن گئے کہ

بھئی ہم تو سوچیں گے

لازم ہے کہ ہم تو سوچیں گے

ہم سوچیں گے

آگے آپ خود سمجھدار ہیں اور ہم ڈرپوک۔

اس لئے اللہ حافظ۔

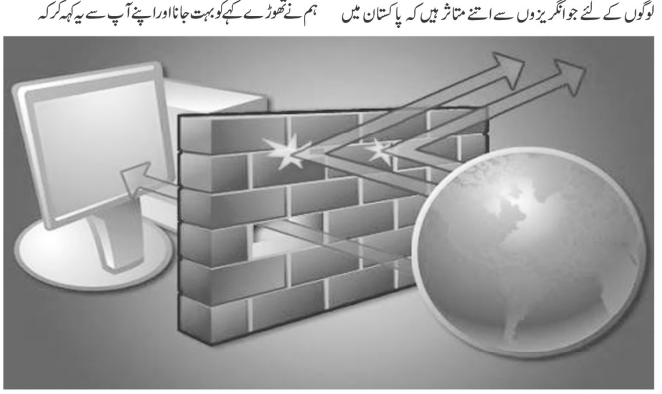

”محمد اشفاق بدایونی۔ ’یارانِ نکتہ داں کے لیے‘ کے مصنّف۔ بہت صاحب مطالعہ۔ بہت شگفتہ بیاں۔ ہماری درخواست پر اشفاق بدایونی ’اطراف‘ کے لیے ہر ماہ ایک تحریر سے نوازیں گے۔ جس میں حالات حاضرہ بھی ہوں گے۔ کچھ تاریخ جغرافیہ بھی۔ کچھ طنز و مزاح بھی۔ آپ سے گزارش ہے پڑھیں اور اپنی رائے سے نوازیں۔“

کاش عدلیہ۔ انتظامیہ اور مقننہ بالکل آزاد ہوں

تحریر: محمد اشفاق بدایونی (جدہ)

کراچی ٹیلی وژن کے ابتدائی سالوں میں بچوں کے لیے پیش کیئے جانے والے ایک پروگرام کا ایک کردار بہت مشہور ہوا تھا وہ کردار تھا ”ماسی مصیبتے“ کا اور اس قسم کے ہی بعض ایسے کردار ہوتے ہیں جو اس قدر مقبولیت عامہ حاصل کرتے ہیں کہ وہ آگے چل کر ایک علامت بن جاتے ہیں۔ کسی ناگہانی کی۔ کسی انہونی کی۔ کسی ایسی تکلیف کی جو برداشت سے باہر ہو۔ یہ ایں اعتبار ہم من حیث القوم ایسی بہت سی مایسیوں کے اژدھام میں رہتے ہیں۔ مثلاً حکومتی ماسی مصیبتے۔ امن و امان ماسی مصیبتے۔ سیاسی استحکام کی ماسی مصیبتے۔ معیشت کی ساسی مصیبتے اور ایک دو ماسی مصیبتے ایسی ہیں کہ جن کے ذکر سے جسم برہنہ کردیے جاتے ہیں سافٹ ویئر اپ ڈیٹ کردیا جاتا ہے اس لیئے اداروں کی ماسی مصیبتے پر کچھ نہ بولنا اور لکھنا ہی بہتر ہے۔

ہمارے ملک کی معیشت کے اعداد و شمار کچھ بھی پیش کیئے جائیں ملک کا عمومی فرد انتہائی خستہ حالی کا شکار ہے۔ کسی بھی ملک کی معیشت کی ترقی

ناچ میری بلبل
پیسہ ملے گا

اور خوشحالی کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں سیاسی استحکام۔ امن و امان کی صورت حال تسلی بخش ہو۔ ملکی درآمدات کم اور برآمدات زیادہ ہو جو ملکی زرمبادلہ کے ذخائر میں اضافے کا سبب بنتی ہیں اور یہ ہی اضافہ ملکی معیشت کے روپ کو نکھارتا ہے۔ دوسری سب سے اہم ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ ملک کا ہر ادارہ اپنی محدودات میں رہ کر اپنا کام کرے۔ عدلیہ انتظامیہ اور مقننہ بالکل آزاد ہوں۔

ہمارے ملک میں اب تک وجود میں لائی جانے والی حکومتوں کی دو قسمیں سامنے آئی ہیں۔ ایک وہ حکومت جو کلیتاً خود اختیاری ہو اور

مجھے کپڑے اتروانے
کا کوئی شوق نہیں

حاکم ہی بااختیار ہو۔ دوسری حکومت۔ حکومت بے اختیاری ہو۔ ان دونوں طرز حکومت کا تذکرہ نہ تو افلاطون کی کتاب ”دی لاز“ میں ملے گا اور نہ ہی کارل مارکس کی ”داس کیپتال“ میں ملے گا اور نہ ہی اسلامی طرز حکومتوں کی تاریخ میں ملے گا۔ حکومتوں کی ان دونوں طرز سے پاکستان کی 77 سالہ تاریخ بھری پڑی ہے۔

حکومت بے اختیاری۔
ملک کی دلچسپ نوٹنکی

حکومت خود اختیاری پر تفصیل سے اس لیئے نہیں لکھوں گا کیونکہ مجھے اپنے جسم سے کپڑے اتروانے کا کوئی شوق نہیں۔

یہاں حکومت بے اختیاری ہمارے ملک کی بڑی دلچسپ نوٹنکی ہے۔ جس میں وزیر کے نام پر ایسے ایسے جوکر دیکھنے کو ملتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر خود پر تو ہنسی آتی ہے اور اگر ان جوکروں کو دیکھ کر ہنسو تو رونا آتا ہے۔

مجھے آج تک یہ سمجھ نہیں آیا کہ حکومت بے اختیاری میں وزیر کا منصب مذکر ہے یا مونث۔ اگر اس منصب پر موجود رہنے والوں کو دیکھا جائے تو ان کی حرکتوں کی وجہ سے یہ مونث لگتا ہے کیونکہ ہر وزیر کے پیچھے ایک ہی صوت گونجتی ہے کہ ”ناچ میری بلبل پیسہ ملے گا“ اسی مذکر اور مونث کی تحقیق میں کسی ایک خاص صوبہ پر نظر ڈالیں جس وزیر اور وہ بھی اعلیٰ قسم کی تو وہ ظاہر طور مونث مگر حرکتیں مذکر والی۔ پولیس کی مردانہ یونیفارم زیب تن کرلی اور یہ بھی لحاظ نہ رکھا کہ وردی سپاہی کی ہے۔ ٹوپی افسر کی ہے اور جوتے اعلیٰ حضرت کے۔ چلو ٹوپی تو جسکے سر پر فٹ آئے پہنا دو۔ وردی سے جسم کی برہنگی تو

ڈھکی رہتی ہے ہاں جوتے جو پہنے ہیں پاکستان کی حکومتی تاریخ میں ان جوتوں کا بڑا دخل ہے کہ اگر آپ نے چلنا ہے تو انہی بوٹوں کے سہارے چلیں۔ جب تک یہ بوٹ ہیں آپ چلتے رہیں۔ اگر یہ بوٹ نہیں ہونگے تو جوتے چلیں گے۔ جوتوں کا چلن بھی ہمارے سیاسی رواج کا ایک اہم حصہ ہے۔

حکومت بے اختیاری چلتی ہی بوٹوں کے سہارے ہے ان بوٹوں کے سہارے چلتے رہو اور جب چاہو تو سر پر رکھ لو تو حکومتی دورانیہ اور بڑھ جائے گا۔

حکومت بے اختیاری کی پشت پر عمر و عیار کی ایک زنبیل ہوتی ہے جس

جب بھی حکومت بااختیار آئی
عوامی ووٹوں کے شمار سے آئی

میں صرف جوتے چمکانے کی پالش اور ڈنڈا ہوتا ہے اور اس زنبیل میں موجود دونوں چیزوں کے اوصاف خفی اور ظاہری سے ہر طرح کا وزیر واقف ہوتا ہے چاہے وہ صرف ہو یا ”اعلیٰ“ ہو یا ”اعظم“ ہو۔

معیشت کا کیا ہوگا۔ کب بہتر ہوگی اسکا تو پتہ نہیں ہاں جب کبھی حکومت با اختیار آئی۔ عوامی ووٹوں کے شمار سے آئی۔ تب راج کریگی خلق خدا جو میں بھی ہوں تم بھی ہو۔ ❁

ہر باپ عظیم۔لائق تعظیم

”اللہ تعالیٰ ’اطراف‘ کو ہمیشہ ایسے نئے نئے سلسلوں کے آغاز کی توفیق دیتا ہے۔ ’ہر باپ عظیم۔لائق تعظیم‘ ایسا ہی بابرکت موضوع رہا ہے۔پاکستان کے ہر گوشے سے بھی۔سمندر پار پاکستانی بھی اپنے جذبات بہت محبت سے لکھ رہے ہیں۔ہم آپ سب بیٹے بیٹیوں کے ممنون اور شکر گزار ہیں کہ ’اطراف‘ کو اپنی محبتوں کا گلشن بنا رہے ہیں۔اپنے حلقہ احباب سے بھی کہئے کہ وہ بھی اپنے عظیم والد کے بارے میں اپنے عقیدت بھرے خیالات سے نوازیں۔حرف و معانی سے محبت کرنے والی خواتین و حضرات ’اطراف‘ کے مستقل خریدار بنیں۔’اطراف‘ ایک منفرد متنوع رسالہ ہے۔جو آپ کے خاندان۔آپ کے احباب کو آپس میں جوڑے رکھنا چاہتا ہے۔آپ کی محبتوں اور صلاحیتوں کا امین بننا چاہتا ہے۔سال بھر کے لیے صرف -/4000روپے۔رسالہ رجسٹرڈ ڈاک سے گھر بیٹھے آپ کو ملے گا۔رابطہ۔ 0300-8210636“

آج بھی دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔کاش اس دن میں اپنے گھر نہ گئی ہوتی۔

سینئر صحافی، مصنفہ رباب عائشہ

نومبر 1994ء کی وہ صبح میں انتہائی کوشش کے باوجود آج تک نہیں بھلا سکی۔آسمان پر ابھی گزری رات کی ہلکی ہلکی سیاہی باقی تھی۔پو پھوٹی بھی نہیں تھی کہ فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔گہری نیند سے اٹھ کر میں نے فون کا ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے سائرہ کی آواز سنائی دی۔”بجو آپ جلدی سے آجائیں ابو کی طبیعت بہت خراب ہے۔“میں نیند میں تھی اس لیے ایک لمحہ کے لیے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے،حواس بحال ہوئے تو فون بند ہو چکا تھا۔رات کو ہی تو میں ابو سے مل کر آئی تھی۔انہیں بخار تھا میں نے پیناڈول کی دو گولیاں کھلائی تھیں۔ان کا بخار کم ہو گیا تو میں نے ان سے کہا کہ ابو میں رات کو یہیں رک جاتی ہوں تو انہوں نے کہا:”نہیں بیٹا تم گھر جاؤ میں اب ٹھیک ہوں۔“میں سوچ رہی تھی کہ رات ہی رات میں کیا ہو گیا۔میں اے ون پہنچی تو ابو کو بستر پر لٹایا جا چکا تھا۔وہ رات کو کسی وقت ہیٹر جلا کر اس کے سامنے بیٹھے تھے پھر ان کی شوگر کم ہوئی اور وہ اپنے حواس کھو بیٹھے اور اس حالت میں ہیٹر پر گر گئے جس سے ان کی ٹانگیں بری طرح جھلس گئی تھیں۔عجیب بات تھی کسی کو پتہ ہی نہیں چلا۔برابر کے پلنگ پر شوکت سو رہا تھا۔ان کے کراہنے کی آواز اوپر سائرہ وہی نے سنی تھی اور سائرہ اور حارث بھاگ کر نیچے آئے تھے۔تھوڑی دیر میں ایمبولینس آ گئی اور ابو کو اسلام آباد کمپلیکس پہنچا دیا گیا۔وہ دس دن اسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں داخل رہے۔وہ دس دن مجھ پر بہت بھاری گزرے۔ان کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔اس دن میں ان کے ساتھ کمرے میں اکیلی تھی، وہ آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔میں ان کے بستر کے پاس بیٹھی ان کے چہرے پر پھیلی اداسی اور زردی کو تک رہی تھی۔چند دن میں ہی وہ کس قدر کمزور ہو گئے تھے۔نڈھال، مضمحل یوں جیسے زندہ رہنے کی آس ہی گنوا بیٹھے ہوں۔سچی بات یہ ہے کہ ان کے دل میں زندہ رہنے کی امنگ تو ساڑھے چار ماہ قبل اس ہی دن مر گئی تھی جب امی نے اس

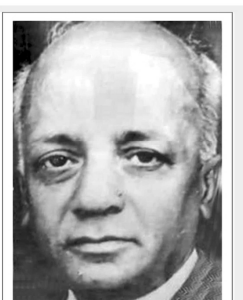

دنیا میں اپنا آخری سانس لیا تھا۔وہ کتنی ہی دفعہ مجھ سے کہہ چکے تھے کہ گڈو کو بلا دو، میں مرنے سے پہلے اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔میں سوچ رہی تھی کہ میں انہیں کیسے بتاؤں کہ ثمینم، آفتاب کو لینے سرگودھا گئے تھے مگر پی اے ایف کے پرنسپل نے اسے بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔میرا بہت دل چاہا کہ وہ کچھ بولیں، اپنے دل میں چھپا ہر غم، ہر اندیشہ میرے سامنے بیان کر دیں شاید میں انہیں تسلی دے سکوں۔انہیں بتا سکوں مجھے اب بھی ان کی ضرورت ہے مگر وہ آنکھیں موندے بالکل خاموش پڑے تھے۔میں نے جھک کر ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ان کی آنکھوں میں خوشی کا وہ احساس میں آسانی سے دیکھ سکتی تھی جیسے کہہ رہے ہوں،”میں خوش ہوں بیٹا کہ تمہیں اب بھی میری ضرورت ہے۔“انہوں نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور میرے سامنے ایک فلم سی چلنے لگی۔میں اپنے بچپن میں سفر کر رہی تھی۔میں عقیل احمد اور عائشہ بیگم کی پہلوٹھی کی اولاد ہوں۔مجھے پا کر وہ دونوں اس ہی طرح خوش ہوئے تھے جس طرح ہر شادی شدہ جوڑا پہلے بچے کی پیدائش پر سرشار ہوتا ہے۔ابو مجھے بتایا کرتے تھے کہ جب تم چھوٹی سی تھیں

تو میں نے اپنی سائیکل کے سامنے ایک ٹوکری لگوا رکھی تھی۔ میں تمہیں اس ٹوکری میں بٹھا کر اپنے گھر سے آفتاب منزل لے جایا کرتا تھا۔ ابو اپنے ہر جذبے میں بہت شدت پسند تھے۔ شدت پسند شخص کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کا دل آئینے کی طرح صاف ہوتا ہے، وہ مصلحت کی خاطر اپنے اوپر کوئی چمکیلا خول نہیں چڑھا سکتا، شدت پسند شخص کے جدول میں ہوتا ہے وہ ہی اس کی زبان پر بھی ہوتا ہے۔ میرے ابو بھی بس ایسے ہی تھے۔ بظاہر غصیلے اور سخت نظر آنے والے مگر اندر سے بہت نرم، میٹھے اور پیار کرنے والے۔ اپنی اولاد کے لیے انتہائی نرم دل رکھتے تھے۔ ان کا غصہ دودھ کے اس ابال کی طرح تھا جو ذرا سی تپش پا کر تیزی سے ابلتا ہے اور پانی کا ایک ہلکا سا چھینٹا اس ابال کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ زندگی میں کبھی انہوں نے ہم بہنوں میں سے کسی کو بھی ایک ہلکا سا تھپڑ نہیں مارا تھا۔ الٹا یہ ہوتا تھا کہ ابو جب مجھ پر غصہ کرتے تو میں منہ پھلا لیتی اور بہت دیر تک ان سے بات نہ کرتی۔ وہ زیادہ دیر میری ناراضگی برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ مجھے گود میں اٹھا کر پیار کرتے اور مناتے۔ وہ میری سالگرہ ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔ پندرھویں سالگرہ پر ابو نے مجھے سرخ جلد والا جو البم دیا تھا وہ برسوں میرے پاس رہا۔

ابو نے ہی میری دوستی اردو ادب سے کرائی تھی۔ انہوں نے ہی میرے دل میں افسانے اور ناول پڑھنے کا شوق پیدا کیا تھا۔ میں ابھی فرسٹ ایئر میں تھی کہ ایک سالگرہ پر انہوں نے مجھے عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' دیا تھا۔ اس وقت میری عمر اس ناول کو سمجھنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ خدیجہ مستور کا آنگن بھی ابو نے ہی مجھے دیا تھا۔ پھر جب میں نے جنگ اخبار میں لکھنا شروع کیا تو ابو میری ہر تحریر میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ وہ میرے مضامین پڑھتے اور مجھ سے ان کے بارے میں بات کرتے۔ ابو کے انتقال سے چند ماہ قبل ایک پبلشر میرے کالموں کی کتاب چھاپنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ابو روز مجھ سے پوچھتے، بیٹا تمہاری کتاب کب چھپ کر آئے گی؟ پتا نہیں میں تمہاری کتاب دیکھ بھی سکوں گا یا نہیں؟ ابو کے جانے کے بعد جب وہ کتاب میرے ہاتھ میں آئی تو مجھے ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔ میرے ابو جو اس کتاب کو دیکھ کر سب سے زیادہ خوش ہونے والے تھے وہ نہیں رہے تھے۔

ابو ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم تھے۔ ایک ایسے عہدے پر فائز تھے جس میں ناجائز دولت کمانے کے بہت سے مواقع موجود تھے۔ انہیں آڈٹ کرنے کے لیے مختلف مقامات پر جانا پڑتا تھا۔ انہیں طرح طرح کی پیشکشیں بھی کی جاتیں لیکن انہوں نے ہمیشہ اپنی اولاد کو حلال کی کمائی کھلائی۔ ان کی ایمانداری میری رگوں میں بھی دوڑتی رہی۔ ابو کے کردار میں سے کتنی ہی باتیں خود بخود میری شخصیت کا حصہ بن گئیں۔ زندگی میں بہت سے مواقع آئے جب مجھے مختلف قسم کی پیشکشیں کی گئیں لیکن ہر بار ابو کا عمل مجھے درست راستہ دکھاتا رہا۔

انا اور خودداری بھی ابو کے کردار کے دو مثبت پہلو تھے۔ انہیں کسی سے سوال کرنا پسند نہیں تھا۔ مجھے بھی کسی سے اپنا جائز کام کہتے ہوئے بھی بڑی ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ وہ کتنے خوبصورت دن تھے جب مادیت پرستی نے اس معاشرے کو اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا۔ جب لوگ انفرادی طور پر سوچنے کے بجائے اجتماعی طور پر غور و فکر کرتے تھے۔ محدود آمدنی ہونے کے باوجود ہمارے گھر کا دسترخوان کافی وسیع ہوتا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ابو کسی نہ کسی پر فضا مقام پر اپنا دورہ لگوا لیا کرتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ صرف امی اور ہم بچے ہی جاتے بلکہ خالد نے ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوتا۔ ہمیں احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہمارے خاندان کا حصہ نہیں ہے۔ بچپن کی وہ ہماری دوستی آج تک قائم ہے۔ ہم ایک دوسرے کے دکھ کو اپنی تکلیف کے طور پر ہی محسوس کرتے تھے۔ خالد کے علاوہ بھی تو قیر بھائی، تنویر بھائی، الماس خالہ، بڑی پھوپی جان کے بچوں میں سے کوئی، غرض کوئی نہ کوئی ہمارے ساتھ ضرور ہوتا۔ مری، کلڈ نہ، باڑیاں، ایبٹ آباد، مانسہرہ، گڑھی حبیب اللہ، راولاکوٹ، یہ تمام دلکش مقامات ہم نے ابو کے ساتھ ہی دیکھے۔

باڑیاں میں چیڑ کے درختوں میں گھرا لکڑی کا وہ حسین گھر جس کے لکڑی کے فرش پر چلنا مجھے بہت اچھا لگتا تھا، آج بھی میری آنکھوں کے سامنے گھومتا ہے۔ میرے کان پہاڑوں سے اترتے مترنم جھرنوں کی آواز سے وہیں آشنا ہوئے تھے۔ بادل جھوم کے آتے اور روئی کے گالوں کی طرح کمروں تک میں گھس جاتے۔ رات کو ہم سب مونگ پھلیاں کھاتے ہوئے لوڈو یا کیرم کھیلتے۔ ایک دوسرے کی گوٹیوں کو پیٹ کر خوشی سے نعرے لگاتے۔ طارق نے وہاں بندروں سے دوستی کر رکھی تھی۔ وہ انہیں بچی کچی روٹیاں اور پھلوں کے چھلکے ڈالتا اور وہ درختوں سے اتر کر ہمارے گھر کے قریب آجاتے۔ ایک دن بندروں کا ایک ننھا سا بچہ طارق کے ہاتھ آ گیا۔ وہ اسے پکڑ کر گھر لے آیا اور اس نے گھر کے سارے دروازے بند کر دیے۔ شام ہوئی تو سینکڑوں بندر جنگل سے نکل کر آ گئے اور انہوں نے ہمارے گھر پر حملہ کر دیا۔ وہ دروازے اور دیواروں پر مکّیں مارنے لگے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ پورا گھر ہی اکھاڑ پھینکیں گے، اس کے باوجود طارق بندر کے بچے کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ آخر امی نے اس سے کہا: گرتم نے بندر کا بچہ نہیں چھوڑا تو یہ بندر حارث کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ یوں طارق نے بندر کے بچے کو چھوڑا اور بندر جنگل کی طرف لوٹ گئے۔

امی کا وہ دلکش جھمکا جس کی کٹوری کے نیچے سچے موتیوں کی لڑیاں لگی ہوئی تھیں اور جو امی کو بہت پسند تھا، کلڈ نہ میں ہی کھویا تھا۔ میری امی بہت حسین تھیں۔ کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر باہر نکلتیں تو ان کے چہرے پر نظر ہی نہیں ٹکتی تھی۔ امی کا وہ جھمکا بہت ہی خوبصورت تھا اور انہیں پسند بھی بہت تھا۔ وہ تیار ہو کر ابو کے ساتھ کسی سے ملنے گئی تھیں۔ چیڑ کے درختوں سے گھری سڑک پر گزر کر جب امی واپس گھر آئیں تو ان کا ایک کان خالی تھا امی کو بہت دکھ ہوا۔ انہیں روتا دیکھ کر ہم سب بھی اداس ہو گئے تھے۔ تو قیر بھائی کے ساتھ خوفناک واقعہ بھی کلڈ نہ میں پیش آیا تھا جب وہ سیر کرنے پہاڑوں کی طرف گئے تھے اور واپسی پر ان کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ انہیں عجیب سا دورہ پڑا تھا۔ سب کا خیال تھا انہوں نے پہاڑوں میں کوئی بھوت دیکھ لیا تھا۔ اس واقعہ کے چند ماہ بعد ہی تو قیر بھائی راول جھیل میں ڈوب کر مر گئے تھے۔

ابو کو جانور پالنے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ ''شیریں'' کو لے کر آئے تھے تو یہ کتیا اتنی چھوٹی تھی کہ وہ اس کو فیڈر سے دودھ پلایا کرتے تھے۔ شیریں بھی ان کا بہت کہنا مانتی اور ان سے بہت محبت کرتی تھی۔ اب کسی سے ناراض ہوتے اور کھانا نہ کھاتے تو شیریں بھی بھوکی پیاسی ابو کی کرسی کے نیچے بیٹھی رہتی۔ وہ برسوں ہمارے گھر میں رہی۔ اس کی موت پر ہم سب کو اتنا افسوس ہوا جتنا گھر کے کسی فرد کے گزر جانے پر ہوتا ہے۔ ہمارا اصفہار والا گھر ''آفتاب منزل'' ایک زمانے میں مختلف جانوروں سے بھرا رہتا تھا۔ کئی کتے، ایک بندر کوئیں اور مرغیاں۔۔۔ یہ سب جانور ابو ہی لائے تھے۔

ابو شوکت سے بھی بے حد محبت کرتے تھے۔ شوکت جس سے ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن تین سال کی عمر سے وہ ہمارے گھر میں رہ رہا تھا اور ابو کا بہت لاڈلا تھا۔ وہ شوکت کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔ اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتے۔ اکثر اسے اپنے پیٹ پر سلاتے۔ جب ابو کا انتقال ہوا اس سے چند ماہ پہلے شوکت کی شادی طے ہو گئی تھی۔ ابو کے جانے کے بعد میں نے ان کی الماری کھولی تو سامنے شوکت اور اس کی دلہن کے لیے وہ جوڑے رکھے تھے جو انہوں نے شوکت کو دینے کے لیے پہلے ہی منگوا لیے تھے۔

آفتاب پر انہوں نے جو محبت نچھاور کی اس کا بدل تو میں ساری دنیا کی دولت دے کر بھی نہیں دے سکتی۔ وہ چھ مہینے کا تھا تب ابو نے یہ کہہ کر اس کو رکھنے کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ ''بیٹا ملازمائیں بھی کہیں بچوں کو پال سکتی ہیں۔ تمہارے دفتر جانے کے بعد یہ اب میرے پاس رہے گا''۔ اگر انہوں نے آفتاب کی ذمہ داری نہ لی ہوتی تو شاید میں کبھی ملازمت نہ کر پاتی۔ ابو اور آفتاب میں نانا نواسے کے علاوہ دوستی کا بہت گہرا رشتہ تھا۔ بعض اوقات میں آفتاب کے منہ سے یہ بات سن کر حیران رہ جاتی جب وہ کہتا امی! نانا مجھ سے ہر بات ڈسکس کرتے ہیں۔''

دکھ کی بات یہ ہے کہ جب ہمارے والدین ہمارے ساتھ ہوتے ہیں، ہمارے آس پاس چلتے پھرتے ہیں تو ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم ان سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ شاید یہ ہی میرے ساتھ ہوا۔ ابو کو کھو کر مجھے پتہ چلا میرا دل تو ان کی محبت سے لبالب بھرا تھا۔ انہوں نے مجھے کیا نہیں دیا تھا۔ ایمانداری، سچائی، خودداری، انا اور سب سے بڑھ کر جذباتیت۔ سائرہ ہمیشہ کہا کرتی تھی ''بجو آپ لوگ جذباتی بہت ہیں۔''

میرا کئی بار جی چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ جذبات نہ ہوں تو انسان چلتا پھرتا روبوٹ بن جاتا ہے، جذبات نہ ہوں تو نا میں اپنے بچوں کو پالنا چھوڑ دیں، جذبات نہ ہوں تو خوبصورت اشعار لکھے جائیں نہ سازوں سے دلکش دھنیں نکلیں۔ یوں بھی جذباتیت تو میں نے اپنے ابو سے لی ہے، یہ جذبہ نہ ہوتا تو کسی غیر کی تکلیف پر تڑپ کر میں کالم نہ لکھ پاتی۔

ابو دس دن اسلام آباد کمپلیکس میں داخل رہے۔ جب ان کی روح اس دنیا کو چھوڑ کر آسمانوں کی طرف پرواز کر گئی تو میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ خوش قسمت تھے وہ کہ انہوں نے کسی کو خدمت کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ہم میں سے کسی نے سالوں ان کی خدمت کرنے کی تکلیف نہیں اٹھائی۔ وہ اپنی زندگی

کے آخر تک اپنا کام خود کرتے رہے بلکہ امی کی طویل بیماری کے دوران انہوں نے امی کی دیکھ بھال بھی کی۔ان کو وقت پر دوائیں دینا سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی تنہائی میں ساتھ دیا۔انہوں نے کئی بار مجھ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں میرے جانے سے پہلے عائشہ دنیا سے چلی جائیں تا کہ میرے بعد انہیں تنہائی کا عذاب نہ سہنا پڑے اللہ نے ان کی اس خواہش کا مان رکھا تھا۔وہ امی کے بغیر جینا نہیں چاہتے تھے۔اس ہی لیے صرف ساڑھے چار مہینے بعد ہی امی کے پیچھے چلے گئے۔ابو چلے گئے تو مجھے شدید احساس پشیمانی نے گھیر لیا۔بار بار ایک ہی خیال دماغ میں ہتھوڑے برسا رہا تھا،اس رات اگر میں اپنے گھر نہ گئی ہوتی ابو کے پاس ٹھہر جاتی تو یہ حادثہ نہ ہوتا۔زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ پشیمانی کی آگ انسان کے روئیں روئیں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

پشیمانی تھی کہ میرے سارے وجود کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، آتے جاتے ایک ہی خیال اُمڈا چلا آتا تھا۔روزمرہ کے کام متاثر ہونے لگے یوں جیسے زندہ رہنے کی خواہش نہ رہی ہو۔گاڑی لے کر کہیں نکلی تو لگتا کہ بس ابھی ایکسیڈنٹ ہوگا اور کسی کو کچھ ہوجائے گا۔میں پھر کسی کی موت دیکھوں گی۔

میں اکثر سوچتی، میں نے تو زندگی کی ہر مشکل کا بہت بہادری سے مقابلہ کیا ہے؟ میں اس حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کر پا رہی کہ ایک دن تو ابو کو دنیا سے جانا ہی تھا۔اپنے آپ کو بہلانے کی میری ہر کوشش ناکام ہوتی رہی اور آخر مجھے سائیکالوجسٹ ڈاکٹر نورین کے پاس جانا پڑا۔وہ ہر ہفتہ ایک گھنٹہ مجھ سے باتیں کرتیں۔آہستہ آہستہ ان کی باتیں مجھے معمولات زندگی کی طرف واپس لانے لگیں۔ڈاکٹر نورین نے ہی مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنے آپ کو کسی اور کام میں مصروف کر دوں۔ابو کے انتقال کے چند ماہ بعد ہی میں نے اپنے آپ کو نارمل کرنے کے لیے بچوں کے لیے کہانیاں لکھنا اور بچوں کی کتابیں چھاپنا شروع کیں۔

اب جب میں ان کتابوں کو دیکھتی ہوں تو یوں لگتا ہے کہ ابو دنیا سے جاتے ہوئے بھی مجھے ان کتابوں کا تحفہ دے گئے جو شاید میں ان کی موجودگی میں بھی لکھ نہ پاتی۔سولہ سال بیت گئے ہیں۔میں پچھتاوے کے اس جال سے باہر نکل آئی ہوں جس نے مہینوں مجھے جکڑے رکھا لیکن آج بھی دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی ہے،خیال کا ایک جھونکا آتا ہے۔

کاش اس دن میں اپنے گھر نہ گئی ہوتی۔"

والد محترم کا ایک ہی شوق تھا۔
اپنے بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت۔ ❁ اختر شہاب

نوٹ:۔جب میں نے اپنی والدہ کا خاکہ" بڑی امی" لکھا تھا تو ڈیڈی (ہمارے والد صاحب) نے اسے پڑھ کر کہا تھا کہ اگر تم ایسا میرے بارے میں بھی لکھو تو میں آج ہی مر نے کو تیار ہوں۔اس وقت تو میں نے کہا تھا کہ اللہ نہ کرے ایسا لکھنے کی نوبت آئے مگر اب ڈیڈی کی سو ویں سال گرہ نزدیک ہے تو میں نے سوچا ان کی زندگی میں ہی خراج عقیدت پیش کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔

"آئندہ مجھے یہ شکل مت دکھانا۔" یہ 'ڈیڈی' کی مجھے تنبیہ تھی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ تو بہت نالائق اور نافرمان اولاد ہے جو باپ نے ایسا کہا۔لیکن اگر آپ اس بات کو معنوی انداز سے لے رہے ہیں تو ایسی کوئی بات نہ تھی۔ یہ در حقیقت ایک لفظی تنبیہ ہی تھی۔ ہوا دراصل کچھ یوں تھا کہ ہم اس وقت ہم عمری کی چالیسویں دہائی میں تھے جب ہمیں خضاب لگانا چھوڑ کے، اپنے بال سفید کر کے کچھ سوبر سوبر سا نظر آنے کا شوق ہوا۔

ڈیڈی (ہمارے والد صاحب) میرے بڑے بھائی کے پاس رہتے ہیں۔میں معمول کے مطابق انھیں ملنے گیا۔انہوں نے میری طرف دیکھا اور بڑے پیار سے بولے" کچھ اپنا بھی خیال رکھا کرو۔" یہ پہلی وارننگ تھی جو ہم نے نظر انداز کر دی۔

اس کے مہینہ پندرہ دن بعد وہ ہمارے گھر تشریف لائے۔میں اس وقت کسی کام سے باہر جا رہا تھا۔سو ڈیڈی کے پاس چند منٹ بیٹھ کر سلام دعا کر کے نکل گیا۔جب میں واپس آیا تو ڈیڈی تو جا چکے تھے مگر جاتے جاتے وہ ہماری بیگم کو یہ کہہ گئے تھے۔"اسے بزرگ بننے کا کچھ زیادہ شوق نہیں ہوتا جا رہا۔" یہ میرے لئے دوسری وارننگ تھی۔ان دو وارننگس کے بعد اگر چہ مجھے ڈیڈی کے سامنے جانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد کچھ دوائیں پہنچانا تھیں سو مجبوراً جانا پڑا۔انہوں نے اپنی اشیاء وصول کیں۔ ہماری طرف دیکھا اور بولے" آئندہ مجھے یہ شکل مت دکھانا۔" یہ ہمارے لئے آخری وارننگ تھی۔

میں نے گھر آ کر پہلا کام اپنے بالوں میں خضاب لگانے کا کیا۔میں جب اپنے بالوں میں خضاب لگا رہا تھا تو مجھے خیال آ رہا تھا کہ اولاد چاہے کتنی بھی بڑی کیوں نہ ہو جائے ماں باپ کی شفقت کم نہیں ہوتی۔اصل گھنڈی اس بات میں ہے یہ ہمارے والد صاحب نے خود عمر بھر خضاب نہیں لگایا۔۔مگر بچوں کا سفید سرا نہیں اچھا نہیں لگتا۔!!

اس ابتدائیہ سے یہ نہ سمجھئے کہ ہمارے والد صاحب ہمیں ایسے ہی پیار سے سمجھایا کرتے تھے بلکہ یہ تو عمر کی وجہ سے ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں یا پھر وہ اس بات کے قائل ہیں کہ جب باپ کا جوتا بیٹے کے پیر میں آ جائے تو پھر اسے مارے نہیں پیار سے سمجھانا چاہیے،سو کچھ بچت ہو گئی ہے۔ورنہ ہمارے بچپن میں جب ہمارے ہم عمر بچے" ٹوڈی" بھی اچھی طرح واقف نہیں تھے،اس وقت بھی ہم" تھری ڈی" کا مطلب بخوبی سمجھتے تھے یعنی ڈیڈی،ڈنڈا اور ڈسپلن۔۔۔اور جو ڈیڈی اب اپنے پوتی پوتوں اور نواسی نواسوں پر ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتے انہی نے اپنے بچوں کو تربیت اسی ڈنڈے اور ڈسپلن سے کی۔جو اس دور کا معمول تھا اور ڈیڈی اس کے شدید قائل تھے۔

ہمارے گھر کا معمول تھا صبح فجر کی نماز کے بعد باہر سیر کو جائیں۔اب نیند آ رہی ہے اٹھنے کو دل نہیں کر رہا مگر ڈیڈی کے ڈر سے گھر سے باہر نکل آئے ہیں۔گھر سے باہر چھوٹا سا لان تھا اس میں بیٹھے۔ٹھنڈی ہوا لگی تو آنکھیں کھلیں سوچا چلو آگے چلیں۔۔۔آگے چل کے گراؤنڈ میں پہنچے تو وہاں بزرگ اور دوسرے حضرات واکنگ اور چہل کر رہے ہوتے تھے۔اب انہیں دیکھ کر ہمیں بھی شرم آئی اور ہم بھی گراؤنڈ میں اتر گئے۔ کچھ تھوڑی ایکسر سائز کی،گراؤنڈ کے ایک دو چکر لگائے اور واپس آ گئے ناشتہ کیا اور اسکول چلے گئے۔لیکن یہ صرف صبح کا معمول نہیں تھا۔شام کو بھی ہم پر لازم تھا کہ عصر کی اذان پر کھیلنے کے لئے نکلیں اور مغرب کی اذان ختم ہونے تک آپ کو گھر میں ہونا ہے۔اب اگر اس میں تاخیر ہو گئی تو پھر سزا تو ملے گی۔

اتوار کا دن بچوں کے لیے خوشی اور مسرت کا دن ہوتا ہے کہ چھٹی ہو گی کھیلیں گے،کودیں گے۔لیکن ہمارے لئے اتوار کا دن بڑا ہی سخت ہوتا تھا۔اس دن حساب کے 50 سوال،ایک سبق انگریزی کا اور اردو کا ایک سبق ہم نے پڑھنا ہوتا تھا۔اب باہر بچے گلی میں کھیل رہے ہیں اور ہم دعا کر رہے ہیں کہ کوئی مہمان آ جائے تو ہماری جان چھوٹے ہم بھی باہر جا کے کھیل لیں۔۔۔کبھی کبھی خوش قسمتی سے ہماری دعا قبول ہو گئی،کوئی مہمان آ گیا اور ڈیڈی ان کے ساتھ مصروف ہو گئے تو ہم بھی موقع غنیمت جان کر کھیلنے نکل لئے لیکن شام کو پھر پکڑے گئے اور اگر کام مکمل نہ ہوا ہوتا تو پھر ہماری خیر نہیں ہوتی تھی۔اردو اگر چہ ہمارے گھر کی لونڈی تھی اور خوشخطی سکھانے،تختی لکھانے اور ہوم ورک کرانے کی ذمہ داری ہماری والدہ دیکھتی تھیں لیکن اگر کبھی غلطی سے بھی والد صاحب نے امتحان لے لیا تو بس پھر خیر نہیں ہوتی تھی۔

ان سختیوں مار پیٹ اور سزا کو اس وقت ہم بہت برا سمجھتے تھے لیکن ہمارے والد صاحب کی بنائی ہوئی یہی بنیاد ہمیں آئندہ زندگی میں بہت کام آئی اور ہم تمام بہن بھائی اچھے مقام پر پہنچے۔اچھے نمبروں سے امتحانات پاس کئے بلکہ ہمارے پرائمری سکول کا ہیڈ ماسٹر صاحب کا تو مقولہ یہی تھا ہمارے یہ رحمانی صاحب (ڈیڈی کا پورا نام انعام اللہ خان رحمانی" ہے) کے بچے ہیں۔انہوں نے تو فرسٹ آنا ہی آتا ہے۔"

ڈیڈی عام طور پر ڈاکٹری دواؤں سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنے ہی دیسی ٹوٹکے اور نسخے استعمال کرتے ہیں۔ایک زمانے میں انہوں نے مدیر کی فرمائش پر ایک ماہنامے میں اپنے نسخے" مریض کی ڈائری" کے نام سے لکھے تھے۔افسوس وہ ریکارڈ مکان بدلنے میں کہیں غتر بود ہو گیا۔چک اور کمر درد ان کا ایک مشہور نسخہ ہے۔انہیں جب کمر میں درد ہوتا ہے تو وہ میرے گھر آتے ہیں اور جب بھی وہ میرے گھر آ کر کہتے ہیں کہ مسعود میری کمر میں درد ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

دوسرے دن میں بازار جاتا ہوں اور خوب دیکھ بھال کے ایک ہی بکرے کا ڈیڑھ کلو، پیٹھ کا گوشت لیتا ہوں۔ چاہیئے تو مجھے سوا کلو مگر قصائی حضرات کی مہربانی سے اس کی صفائی ستھرائی میں چونکہ آدھا پاؤ یا تین چھٹا گوشت نکل جاتا ہے تو دوبارہ لگوا کر سوا کلو گوشت صاف ستھرا علیحدہ کروالیتا ہوں۔ اب اس گوشت کے آدھ آدھ پاؤ کے دس برابر حصے کیے جائیں گے۔ ہماری بیگم صاحبہ رات بھر اس کو چولہے پہ چڑھا کر اس کی یخنی بنادیں گی۔ ہمارے والد صاحب صبح سویرے تشریف لاتے ہیں۔ یخنی پی کے اور گوشت کھا کے چلے جاتے ہیں۔ یہ ان کا ناشتہ ہے۔ یہ ان کا دس روزہ کمر ٹھیک کرنے کا ٹوٹکا ہے اور بقول ان کے اس سے کمر کا ایک سال کا بیمہ ہوجاتا ہے۔ ویسے بھی یہ انتہائی حیرت انگیز ٹوٹکا بے شمار ڈاکٹری حکمت کی دواؤں کے مقابلے میں کمر اور چک کا درد صحیح کرنے میں بے مثال ہے۔ اس ٹوٹکے کی مثال مدنظر رکھتے ہوئے جب گردن میں درد اور سروائیکل کے مریض کو گردن کے گوشت کی یخنی اس طور پر بنا کر پلائی گئی تو اسے بھی حیرت انگیز طور پر فائدہ ہوا۔ ابھی حال ہی میں ان کی شوگر ہائی ہوگئی تو انھوں نے کسی ڈاکٹری دوا کے بجائے جو نسخہ استعمال کیا اس کا مین جز نیم کی تازہ کونپلیں تھیں جسے اور چیزوں کے ساتھ ملا کے ان کی چٹنی بنا کے کئی دن پی۔ اللہ کا کرم ہے اب انہیں شوگر نہیں ہے۔

ملکہ اکبری سلطانہ! یہ ہماری والدہ کا نام ہے۔ اصل نام تو ان کا اکبری تھا مگر ملکہ اور سلطانہ انہیں ڈیڈی کی محبت نے بنا دیا تھا۔ وہ ایم اے سلطانہ کے نام سے دستخط کرتی تھیں۔ جو والد صاحب نے انہیں سکھائے تھے۔ بچپن میں جب ڈیڈی، امی کو 'س' کے نام سے پکارا کرتے تھے تو ہم اور دوسرے لوگ بڑے حیران ہوتے تھے کہ یہ بلانے کا کیا طریقہ ہے۔ یہ تو بہت بعد میں سمجھ میں آیا کہ 'س' اصل میں سلطانہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ ہماری والدہ کے لئے گھر میں خاص طور پر حور، زیب النساء آتے تھے جو بچوں کو پڑھنے کی ممانعت تھی۔ البتہ بچوں کے رسالوں میں بچوں کی دنیا، تعلیم و تربیت یا نونہال میں سے کوئی ایک رسالہ آجاتا تھا۔ یہیں سے مجھ میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ شروع میں چھپ چھپا کے حور، زیب النساء بھی پڑھتا رہا اور بعد میں لائبریری کا ممبر ہوگیا۔

ہمارے دادا قدرت اللہ خان جو کاس گنج ضلع ایٹہ کے ایک گاؤں مرے چی کے پشتینی رئیس تھے، کے دو ہی بیٹے تھے۔ بڑے انعام اللہ خان یعنی ہمارے والد صاحب اور اور چھوٹے اسد اللہ خان۔ ہماری دادی کا چونکہ ڈیڈی کے بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا اور اس کے بعد ہمارے دادا نے دوسری شادی نہیں کی تھی لہٰذا انہوں نے دونوں بچوں کو بڑے لاڈ و پیار سے پالا۔ تعلیم کی روشنی تو ہمارے خاندان میں پہلے سے ہی موجود تھی ہمارے پردادا میاں خان ہیڈ ماسٹر تھے اور ہمارے دادا نے بھی میٹرک کیا تھا۔ سو انہوں نے اپنے بچوں کو بھی اچھی تعلیم دلائی اور مزید پڑھائی کے لیے علی گڑھ بھیجا۔

پاکستان بننے کے بعد ہمارے دادا نے پاکستان آنے کا سوچا اور چونکہ دوسرے رشتہ دار پاکستان آنے کو راضی نہ تھے تو شاید یہی سبب تھا یا کچھ اور کہ انہوں نے اپنی تمام جائیداد انہیں ہی سونپ دی اور لاہور آنے کے بعد ملازمت کرلی تاکہ بیٹوں پر بوجھ نہ بنیں۔ وہ آخری دم تک ملازمت کرتے رہے۔ ہمارے والد صاحب کو بھی پاکستان منٹ، لاہور میں اسسٹنٹ بلین کیپر کی ملازمت مل گئی۔ ہمارے چچا اسد اللہ خان جن کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا۔ اچھے شاعر اور ادیب تھے، سو وہ پشاور ریڈیو سے منسلک ہوگئے اور وہاں کافی ڈرامے اور غزلیں وغیرہ لکھیں۔

یہ مختصر سی خاندانی ہسٹری بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے گھر میں تشدد کے عنصر کی زیادتی کے دو اسباب تھے ان میں سے پہلا تو ہمارے والد صاحب شہزادوں کی طرح پرورش تھی اور دوسرا تعلیم کی اہمیت تھی۔ ڈیڈی باقی تمام باتوں پر تو سمجھوتہ کر سکتے تھے مگر تعلیم اور تربیت پر کوئی سمجھوتہ نہیں تھا۔ اس سختی کا عنصر صرف ہمارے گھر میں نہیں تھا یہ اس دور کا رواج تھا اور اسکول میں بھی ماسٹر حضرات دے دھنا دھن بچوں کی پٹائی کیا کرتے تھے۔ اس زمانے کے ایک مشہور مقولے" (ڈنڈا پیر اے وگڑیاں تگڑیاں دا۔)" (ڈنڈا بڑے بڑے بگڑے ہوؤں کو سیدھا کر دیتا ہے) کے مطابق ہم اور ہمارے دوست نہ صرف گھروں میں پٹا کرتے تھے بلکہ اسکول میں بھی غلطی پر سزا ملتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم معاشرتی آداب سیکھتے تھے۔ ایک دوسرے سے محبت رکھتے تھے اور آپس میں پیار محبت کی فضا قائم کرتے تھے۔ بزرگوں کی اہمیت موجود تھی۔ چھوٹوں سے پیار اور بڑوں کا ادب بزرگوں کی اہمیت اور اخلاق کی تربیت اس دور کے معاشرے کا لازمی جز تھا۔ یعنی اگر ہم اپنے گھر سے دور ساتویں محلے بھی چلے جاتے تھے اور وہاں کوئی بزرگ ہمیں پہچان کر محض یہی کہہ دیتا کہ اچھا تم فلاں کے بیٹے ہو تو وہیں ہماری میّا مرجاتی تھی اور چاہے ہم نے کوئی شرارت بھی نہ کی ہو۔ ہم بالکل سیدھے ہوکر گھر کی طرف واپس چل دیا کرتے تھے۔

ڈیڈی اگرچہ زیادہ سوشل نہیں ہیں لیکن کہیں چلے جائیں تو بور بھی نہیں ہوتے اور محفل کو پوری طرح انجوائے کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی جوانی بلکہ پوری زندگی ہی ہم سات بہن بھائیوں کی تربیت تعلیم اور پڑھائی کی خاطر اپنی خوشیوں کو قربان کر کے گزار دی اور اور اپنے انتہائی حق حلال کی کمائی سے ہم لوگوں کی پرورش کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے زندگی میں فلم بینی یا سگریٹ نوشی جیسی کوئی علت نہیں پالی۔ انہیں بس ایک ہی شوق تھا، اپنے بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت، جس میں وہ کامیاب رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سے کراچی شفٹ ہونے تک والد صاحب ماشاء اللہ خوب صحت مند تھے اور اپنی سرگرمیاں بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ باہر نکلنا، واک کرنا، یاروں دوستوں سے ملنا اور خاص طور پر رمضان میں پہلی صف میں کھڑے ہو کے تراویح پڑھنا ان کا معمول تھا۔ لیکن برا ہو اس 'کرونا' کا، جس کی وجہ سے ہم نے ڈیڈی کو ان کی صحت اور سلامتی کی خاطر زبردستی گھر میں رہنے پر مجبور کر دیا اور جب کسی بزرگ شخص کو گھر یہ بٹھا دیں تو پھر وہ تیزی سے خرابی صحت کی طرف جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اب ڈیڈی صاحب فراش ہوگئے ہیں۔ ڈیڈی میں بظاہر زیادہ خدا ترس نظر نہیں آتے ہیں لیکن جب وہ صاحب فراش ہوئے تو ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ کافی لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ صاحب فراش ہونے کے باوجود انہوں حوصلہ نہیں ہارا ہے اور جب بھی موقع ملتا ہے واکر کے سہارے چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی سماعت کمزور ہوگئی ہے لیکن یادداشت ابھی بھی اچھی ہے۔ جوانی میں ان کی طبیعت میں بہت غصہ تھا جو نہ جانے کہاں کھو گیا ہے۔ لیکن تعلیم سے محبت کے سبب بچوں میں علم کا شوق بڑھانے کے لئے اب وہ اب غصہ کرنے کی بجائے، اپنے پوتا پوتیوں اور نواسہ نواسیوں کو کسی شعر یا کسی محاورے کو پورا کرنے کے بدلے میں انعامات دیتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اللہ تعالی ڈیڈی کی نہ صرف سنچری پوری کرائے بلکہ صحت اور تندرستی کے ساتھ ان کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ (آمین)

نماز مغرب کے بعد صحن میں چھڑکاؤ۔ موتیا کے پھول توڑے جاتے۔ سب میں تقسیم کیے جاتے۔

عائشہ ذکی

یہ صرف ایک جملہ نہیں ہے بلکہ اپنے اندر ایک پورے فلسفہ کائنات و حیات کا غماز ہے۔ کیونکہ باپ کا ب: بردباری: الف: اعتدال/ انفرادیت، اور پ: پیدا اور پرورش کرنیوالی ہستی کو تعارف کرواتے ہیں۔ جب یاد کا البم کھولوں تو کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں۔ بلاشبہ ان لوگوں میں سرفہرست میرے پیارے بابا ہیں (آج بھی ان کے نام کے ساتھ مرحوم کا لفظ لکھنے کو دل امادہ نہیں ہوتا) ہمارے مشرقی معاشرے میں جہاں بیٹی کو بوجھ سمجھا جاتا ہے وہاں میری پیدائش پر میرے بابا نے خوب دھوم دھام سے میرا عقیقہ کیا۔ میری پیدائش کے اگلے سال ہی بابا کو حج کا فریضہ ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئ باوجود امی کی شدید خواہش کے مجھے اکیلا چھوڑ کر جانے کو تیار نہ ہوئی۔ بابا "کھلاؤ سونے کا نوالہ لیکن دیکھو شیر کی نگاہ سے" کے مقولے کے قائل تھے، اسی لئے خصوصاً دینی امور کی ادائیگی میں کسی قسم کی رعایت روا نہیں رکھتے تھے۔ نماز، اذکار، تلاوت کا باقاعدہ شیڈول بنا کر اس پر سختی سے عمل کرواتے تھے۔ میری پھولوں، پودوں اور پرندوں سے محبت دیکھتے ہوئے گھر کے صحن میں ہر موسم کے خوشنما پھولوں والے پودے باقاعدگی سے لا کر صحن کو سجاتے تھے۔ لوہے کا پنجرہ میرے جھولے کے عین سامنے ایستادہ تھا جسمیں کبھی مرغیاں، آسٹریلین طوطے، میاں مٹھو، اور کبھی چھوٹی چھوٹی چڑیائیں اپنی اپنی بولیوں سے صحن کی فضاء میں رونق لگائے رکھتی

تھیں۔ موسم گرما کی گرم شاموں میں جب نماز مغرب کے بعد صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کرنے کے بعد موتیا کے پھول توڑے جاتے تو ہم باپ بیٹی میں جائیداد کے بٹوارے کی مانند تقسیم کیے جاتے تھے۔ نجانے خوشیوں کی عمر اتنی مختصر کیوں ہوتی ہے۔ بابا کا وزن دن بدن گرتا جا رہا تھا اور طبیعت بھی کافی دنوں سے گری گری تھی، مختلف ڈاکٹروں نے مختلف اقسام کے خون، ذیابیطس اور دیگر ٹیسٹ کروائے لیکن کوئی وجہ سامنے نا آسکی، ایک دن بابا کے ایک کلائینٹ ان سے ملنے آئے اور ان کو ڈاکٹر سرور جہاں زبیری کے پاس لے گئے، انھوں نے بھی کچھ ٹیسٹ کروائے جن میں بابا کو جگر کا سرطان آخری اسٹیج پر ڈائیگنوس ہوا۔ اپنے آخری ایام میں بابا نے امی کو میرے سامنے بلا کر خصوصی ہدایت دیں کہ انکے جانے کے بعد میری پڑھائی کا خاص خیال رکھیں مجھے میرے پیروں پر کھڑا ہونے دیا جائے اور جلد بازی نہ کی جائے۔ ساتھ ہی شادی کے سلسلے میں میری رائے کو مقدم رکھنے کا کہا۔ اس واقعہ کے ایک ہفتے کے بعد پی بابا ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے لیکن آج بھی انکی کی ہوئی نیکیوں کی فصل میں اور امی کاٹ رہے ہیں۔ سورہ کہف میں باپ کے صالح ہونے کی بات کو میں اپنی زندگی میں بابا کی کی گئی نیکیوں کے صلے کے طور پر دیکھتی ہوں۔ اللہ پاک میرے بابا کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور مجھے انکے لئے صدقہ جاریہ بنانے۔ آمین۔

میں ایک بار ہمت کر کے ابو سے بات کر لیتا آج میں اپنی ذات کا مجرم بن کر نہ جی رہا ہوتا۔

عادل علی

کرم فرماؤں سے گزارش ہے کہ فادرز ڈے وش کرنے کے بجائے عملی طور زندگی میں اپنے والد کو اپنی ریڈ لائن بنا لیں کہ زندگی میں جو بھی کرنا ہے انہی کے فخر و افتخار کے لیے کرنا ہے۔ زندگی ایسے جیئیں کہ آپ کے والد کے لیے آپ کے ہونے کا احساس ہی کافی ہو اور آپ خود اس لائق ہوں کہ آپ کے لیے والد کا حیات ہونا ہی سب کچھ ہو باقی آپ خود سنبھال لیں۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے زندگی طرح طرح کے امتحان لے کر ہمارا کچومر بناتی ہے۔ کبھی جھلستی آگ میں ڈال کر کندن بناتی ہے تو کبھی زندگی بھر کی مشقت کو بھی لاحاصل قرار دے دیتی ہے۔ کبھی ہم موردالزام ٹھہرا کر کٹہرے میں کھڑے کر دیے جاتے ہیں تو کبھی ہمیں بیگانہ محسوس کروایا جاتا ہے۔

تینتیس سالہ زندگی میں بہت ساری مشکلات کے ساتھ ایک مشکل ترین ذاتی زندگی گزارتے ہوئے بہت ساری کامیابیاں و عزتیں دنیا سے سمیٹی ہیں جبکہ ابو اچانک راہ سفر میں دامن چھڑا گئے مگر مجھ پر ایک ایک قدم پر احسان ان کی دعا کا ہے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ لوگ میرے والد سے کہتے تھے کہ یہ تمہاری محنتوں کی تھکن اتارے گا اور ایک باپ کی تھکن اس کی اولاد کی طرف سے ملنے والی عزت سے اترتی ہے۔ گزشتہ شب بہت بھاری گزری۔۔

نصف شب جب آنکھ لگی تو کبھی ابو کی قبر نظر آئی کبھی وہ تو کبھی ان کی ڈانٹ وغصہ تو کبھی ایک ملال کے آنسو بہتے رہے کہ میں آخری لمحوں میں نہ مل سکا آخری ملاقات نہ کر سکا آخری معافی نہ مانگ سکا۔ رات بھر شاید انہیں بھی تنگ کیا اس لیے وہ غصے میں تھے۔ میری زندگی کا سب سے بڑا خوف تھا کہ کسی بھی طرح ابو کی دل آزاری نہ ہو مگر تقدیر کے اپنے ہی فیصلے ہوتے ہیں کہ وہ کس موڑ اور مرحلے سے گزار کر کس مقام تک لے جائے۔ میں خطاوار ہوں کہ مجھ سے زندگی میں محض ایک ہی غلطی دو بار سرزد ہوئی اور انہیں تکلیف ہوئی۔۔ دوسری بار شاید بہت برا مان گئے اور دنیا سے چلے گئے اور میں ملال کی زندگی کا شکار ہوں جبکہ میں جانتا ہوں وہ ناراض نہیں ہو سکتے مگر پھر بھی۔ میں ہر محفل میں رشک نگاہ ہوتا ہوں اور مجھ سے لوگ خود ہی میرے والد کا پوچھے بنا رہ نہیں پاتے اور میں بہت فخر سے کہتا ہوں کہ میں آج جو بھی ہوں یہ سب اللہ کے بعد میرے والد کی بدولت ہے۔ میں ہر وقت ان سے معافی مانگتا رہتا ہوں جبکہ مجھے معلوم ہے میں نے ارادتاً کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا حالات کا بہاو مجھے چلاتا چلا گیا۔۔

میں نے دنیا سے رحم کی بھیک مانگی کہ اس موڑ تک نہ لائیں کہ ان کی دل آزاری ہو کیونکہ میں کسی کا بھی سامنا کر سکتا ہوں مگر ابو کے منہ سے ایک لفظ نہیں سن سکتا۔ لوگوں کے آگے گڑگڑانے سے بہتر تھا میں ایک بار ہمت کر کے ابو سے بات کر لیتا اور آج میں اپنی ذات کا مجرم بن کر نہ جی رہا ہوتا۔ بتانے کا مقصد کسی کی ہمدردی سمیٹنا نہیں ہے کیونکہ مجھ میں سسکتے مرجانے کی حد تک خودداری وحوصلہ ہے اب اسے کوئی انا کا نام دے یا کچھ بھی مگر مجھے ظلم و ناجائزی کے آگے جبراور مصلحتاً بھی جھکنا قبول نہیں ہے۔۔ میں آپ بیتی بیان کر کے یہ حوصلہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم سب انسان ہیں کہیں ہم اچھے ہیں تو کہیں ہم برے ہیں۔ ہم جن کی مرضی کے مطابق نہ ہوں ان کے لیے برے ہیں اور جن کے مفادات کو پورا کرتے ہیں ان کے لیے ہم اچھے ہیں اور یہ معاملہ سب کے ساتھ ہے۔

گر کسی سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے یا کوئی نافرمانی اور ان کے والدین حیات ہیں تو ایک لمحہ ضایع کیے بنا ان کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لیں کہ ان کہی وان سنی جدائی کا ملال اٹھا کر جینا بہت مشکل ترین عمل ہے۔

باپ مثل خدا ہوتا ہے اس کے ہاں معافی کا در کبھی بند نہیں ہوتا۔۔۔

میں ٹپیکل عوام کی طرح باپ کی عظمت بیان کر کے بھی داد سمیٹ سکتا تھا مگر یہ کام انہی کو مبارک جن کو لگتا ہے کہ باپ کی عظمت فادرز ڈے پر لکھنے سے بیان ہو سکتی ہے۔۔ حقیقت کا سامنا کریں حقیقت میں جیئیں۔

چھوٹے یا بڑے خطاوار ہم سب ہی ہیں کوئی بھی ایسا نہیں جسے معافی کی ضرورت نہیں۔۔ والسلام

پاپا۔ آپ کیوں روٹھ گئے۔ پاپا لوٹ آؤ۔ لوٹ آؤ۔

نبیلہ تبسم

پیارے ابا جان! آپ کے دم قدم سے زندگی میں رونق تھی۔ آپ کی محنت اور قربانیاں میری زندگی کے لیے روشن مثال ہیں، آپ کی محبت اور راہنمائی ہمیشہ میرے دل میں زندہ رہے گی۔ آپ کے سایے نے مجھے دوام بخشا، جینے کا حوصلہ دیا۔ آپ کی دعاؤں نے ہمیشہ میری راہوں کو روشن کیے رکھا اور مجھے آگے بڑھنے میں مدد دی۔

میں کیسے بھلاؤں آپ کے احسانات، وہ لمحے، وہ یادیں، آپ کی یادیں میرے دل میں جینے کی امنگ پیدا کرتی ہیں، یہ یادیں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ آپ کی کمی کو کوئی پورا نہیں کر سکتا۔ آپ کی نصیحتیں اور محبت بھری باتیں مجھے یاد آتی ہیں، وہ ہمیشہ میری راہ نمائی کریں گی۔ آپ کی مسکراہٹ اور محبت بھرے لمحات کبھی بھلائے نہیں جاسکتے۔ آپ کی موجودگی میری زندگی کا سب سے بڑا تحفہ تھی۔

آپ کی کمی کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ آپ کی قربانیوں کا ہر پل شکریہ، میں آپ کی یادوں کے سہارے زندہ ہوں۔

پاپا! آپ کیوں روٹھ گئے، کیوں ہمیں اداس چھوڑ گئے۔ پاپا! لوٹ آؤ، لوٹ آؤ نا پاپا! میری آنکھیں آپ کی منتظر ہیں۔

میرے بابا سیاحت کے شوقین تھے۔ یہ تصاویر میرا ان کے لیے خراج۔

ڈاکٹر محمد عظیم شاہ بخاری

میرے دوست مجھ سے اکثر پوچھا کرتے ہیں
شاہ جی، آپ کی زندگی کا سب سے پہلا ٹور کہاں کا تھا۔۔۔۔۔؟؟
اور میں اپنی سوچ سمجھ کے مطابق جو یاد آتا ہے بول دیتا ہوں۔ لیکن آج میں نے غور کیا تو مجھے یاد آیا کہ میرا

سب سے پہلا ٹور ناران اور کشمیر کا تھا اور یہ میں نے اپنی نہیں اپنی ماں کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

میرے والد، میرے پاپا کو سیاحت کا جنون تھا شاید اسی لیئے وہ میرے نانا کے خط لکھنے کے باوجود بھی میری والدہ کو پہاڑوں پر گھمانے لے گئے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس میں ایسی خاص بات کیا ہے؟؟

خاص بات یہ ہے کہ میں اس وقت ان کے پیٹ میں تھا اور قریباً ساڑھے سات ماہ کا تھا۔امی کے پیٹ میں سانس لے رہا تھا اور میری دھڑکنیں بھی چل رہی تھیں۔بس شعور نہیں تھا۔اور انہی دنوں اپنے پاپا کی بدولت میں نے ماما کی آنکھوں سے چترال دیکھا۔ایک دور دراز اور دشوار گزار پہاڑی علاقہ۔

یہ تھا میرا پہلا ٹرپ :)

ماں باپ اپنی، بہت سی خوبیاں اور خامیاں، بہت سے Traits اپنی اولاد میں منتقل کرتے ہیں۔الحمدللہ، پاپا میں ہزاروں خوبیاں ہیں (جن کا میں یہاں قطعاً ذکر نہیں کروں گا، اُن کو قریب سے جاننے والے یہ بات جانتے ہیں) لیکن اُن کی جو ایک خوبی، ایک شوق مجھ ناچیز کو ملا ہے وہ ہے سیاحت کا جنون، گھومنے کا شوق۔آوارگی کی خواہش، Wanderlust۔

سیاحت کے حوالے سے دو ہی لوگ میرے آئیڈیل ہیں۔

ایک مُستنصر حسین تارڑ صاحب جن کی کتابیں پڑھ پڑھ کہ میرے شوق کو جلا ملی اور میں کئی جگہوں سے روشناس ہوا جبکہ دوسرے والدِ محترم جن کی سیاحت براہِ راست مجھ پر اثر انداز ہوئی۔

میں اور آپ تو آج کل کے جدید دور میں آرام سے گھوم رہے ہیں۔ ہمارے پاس نت نئی گاڑیاں، موبائل، بائیکس، جی پی ایس، گوگل، پاور بینک اور اسی قسم کی ہزاروں نئی اشیاء ہیں جنہوں نے ہمارے سفر کو انتہائی آسان اور سہل بنا دیا ہے لیکن کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ آج سے بائیس پچیس سال پہلے جب شمال میں اکثر جگہوں پر سڑکوں کا نام ونشان بھی نہ تھا، پہاڑی علاقوں کا سفر کیسا ہوتا ہوگا؟؟؟

انتہائی محدود وسائل کے ساتھ لوگ کیسے سیاحت کرتے ہونگے؟؟ کیسے زندگی گزارتے ہوں گے؟؟؟

لیکن انہی مشکل اور کچے پکے راستوں پر، دشواریوں اور محدود ذرائع آمدورفت کے ساتھ میرے پاپا نے اس زمانے میں پورا پاکستان کھنگال ڈالا۔۔۔۔جی ہاں تقریباً پورا پاکستان۔

چترال سے لے کہ سوات، ناران، کاغان، ہنزہ، گلگت، چلاس، نلتر، خنجراب، کوئٹہ، چمن، زیارت، تھرپارکر، کراچی اور نہ جانے کہاں کہاں تک۔

ایک سوزوکی مہران اور انکے چار پانچ دوست (جو ہر ٹرپ میں بدلتے رہتے سوائے انکل جاوید اختر پیرزادہ کے جو انہی کی طرح سیاحت کے دلدادہ تھے) جو اس زمانے میں بھی ماڈرن تھے۔جینز، سگار، نت نئے کیمرے اور اسی طرح کی دوسری چیزیوں کے ساتھ ہر سال نکل جاتے تھے۔یہ چیزیں جب میں تصاویر میں دیکھتا تھا تو پاپا سے کہتا تھا: "پاپا یہ میرے لیئے ہی رکھ دیتے"۔اور پاپا بس مُسکرا دیتے ۔۔۔۔۔ :)

۔یہ ڈاکٹر، بینکر اور وکیل کا گروپ نہ جانے کہاں کہاں گیا، کیا کیا نئے تجربات کیئے، کیا کیا نہ دیکھا میں آپ یہ سب بتانے سے قاصر ہوں۔ پاپا اور ان کے دوستوں کی تصاویر دیکھ کر ہی میرے اندر سیاحت کا جنون پیدا ہوا اور سات سال کی عمر میں ہی میں نے تہیہ کر لیا کہ جہاں جہاں بھی میرے پاپا گئے ہیں وہاں وہاں میں بھی قدم ہوں گے۔جن جن جگہوں کو ان کی آنکھوں نے دیکھ رکھا ہے وہی مناظر میں اپنی آنکھوں میں قید کروں گا۔اور یہی میرے والدِ محترم کو میرا ٹریبوٹ ہے۔۔۔۔۔

ان تصاویر میں آپ 25 سال پہلے کی وہ وہ خوبصورت جگہیں دیکھ سکتے ہیں جو آج ویسی نہیں ہیں، جن کا حُسن آج میلا پڑ گیا ہے، جو آج شوقین افراد کے نرغے میں ہیں۔

یہاں میں پاپا کا سنایا ہوا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

پاپا کوئی 1989 میں خنجراب بارڈر تک گئے تھے۔اُن دنوں پاکستان اور چین کے درمیان کوئی چیک پوسٹ یا پراپر بارڈر پوائینٹ نہیں تھا بس ایک پتھر لگا ہوا تھا جس کے ایک طرف پاکستان اور دوسری طرف چین کا جھنڈا بنا ہوا تھا۔آج بھی یہ پتھر پاکستان کی حدود میں موجود ہے۔خیر! جب یہ لوگ وہاں سے گزرے تو بارڈر فورس کا کوئی جوان وہاں نہ تھا اور یہ بھول کر چین کی حدود میں چلے گئے، کوئی 3،4 کلومیٹر اندر جانے کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ ہم چین پہنچ چکے ہیں اور شومئی قسمت کہ چینی فوجیوں نے انہیں دیکھ لیا۔یار لوگوں کی تو سٹی گم۔خیر تمام واقعہ سُننے کے بعد چینی فوجیوں نے انہیں چائے پلائی، تصاویر بنوائیں اور عزت کے ساتھ بارڈر تک چھوڑ نے آئے۔بارڈر پہنچنے پر پاکستانی بارڈر فورس کا بندہ بھی نظر آ گیا جس نے آگے جانے پر ان سے رشوت کا تقاضا کیا اور دے دلا کر معاملہ رفع دفع کیا گیا۔

خیر اپنے والدِ محترم کے سُنہرے تجربات اور یادگار تصاویر ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی۔

اللہ پاک سے دُعا ہے کہ پاپا کو لمبی اور صحت والی زندگی نصیب ہو۔آمین

ابو۔آپ آجائیں۔میرے بوڑھے وجود کو پیار سے اپنے کاندھے پر اٹھالیں۔

سعدیہ سیما

اس وقت رات کے آخری پہر کا ابتدائی حصہ ہے۔ میں اپنے فلیٹ کی بالکنی میں تنہا بیٹھی ہوں۔ بائیس سال کی عمر میں خوابِ غفلت کی نیند آتی ہے لیکن میری آنکھوں سے نیند کے کوسوں دور ہونے کے باوجود بھی میری آنکھیں بے خواب نہیں ہیں۔ان آنکھوں میں ابّو سے ملنے کے ایسے سپنے سجے ہوئے ہیں جن کی تعبیر اس زندگی میں تو ملنی ناممکن ہے۔میرے شوہر اور تمام سسرال والے اس وقت اپنی اپنی خواب گاہوں میں میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ابّو! اس وقت مجھے آپ کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔مجھے یاد ہے کہ اپنی رخصتی کے وقت میکے کی دہلیز پار کرتے ہوئے میرے ذہن کے پردے پر صرف آپ کی شبیہ موجود تھی۔ میں چاہتی تھی کہ صرف ایک بار آپ کہیں سے آ جائیں اور مجھے اپنی دعاؤں کے زادِ راہ کے ساتھ اپنے سینے سے لگا کر رخصت کر دیں۔میکے میں باپ کا طاقتور وجود سسرال میں بیٹی کی موجودگی کو ایک ایسا ان دیکھا سہارا دیتا ہے جو دکھائی تو نہیں دیتا لیکن ساری عمر محسوس ہوتا ہے۔ابّو میں اس سہارے کو محسوس کرنا چاہتی ہوں۔اپنی شادی شدہ زندگی کے پچھلے سات مہینے میں ہر روز آپ کی ضرورت محسوس کی ہے۔زندگی بہت مشکل محسوس ہونے لگی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک ایسا عضو ہوں جو میرے سسرال کے جسم کے تمام نظام کو چلانے کے لیے یکا یک ضروری تو ہو گیا ہے لیکن اب اسے چھُٹی نہیں ملنے والی۔ مجھے پتہ ہے اگر آپ اس وقت سامنے بیٹھے ہوتے تو مجھے اپنے دل سے تشبیہ دے کر میرا دل رکھ لیتے مگر ابّو میں تو شادی کے پہلے سال ہی تھکنے لگی ہوں۔سوچتی ہوں جن لڑکیوں کے باپ نہیں ہوتے انھیں شادی ہی نہیں کرنی چاہیئے۔ میں اس وقت اس بالکنی میں بیٹھی اندھیری سڑک کو گھور گھور کر دیکھ رہی ہوں۔دور ایک بنگلے کے باہر لگا بلب سڑک کے جُزوی حصے کو روشن کر رہا ہے۔اب میرا تصوّر طاقت ور ہو گیا ہے۔آپ مجھے وہاں کھڑے نظر آ رہے ہیں۔آپ نے مُسکرا کر مجھے دیکھا اور ہاتھ ہلا دیا۔میں بھی بے اختیار مسکرا دی ہوں مگر پتہ نہیں کیوں دو آنسو لڑھک کر میرے گالوں تک آ گئے ہیں۔آپ نے فلیٹ کی جانب بڑھنا شروع کر دیا ہے۔میرے دل کی دھڑکن آپ کے بڑھتے قدموں کا ساتھ دے رہی ہے۔اب آپ فلیٹ کے نیچے ہیں، آپ اندر داخل ہو گئے۔میں سوچتی ہوں کہ آپ سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں تھوڑی دیر میں یہاں آ جائیں گے اور مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

27 سال بعد اس وقت رات کا آخری پہر ہے۔ میں جائے نماز پر بیٹھی ہوں۔میری عمر کی پچاسویں دہائی شروع ہونے میں کچھ دن رہ گئے ہیں۔عمر کا یہ وہ حصہ ہے جب نیند آنکھوں سے رُوٹھنے لگتی ہے۔میرے شوہر اس وقت اپنی آخری آرام گاہ میں آرام کر رہے ہیں۔ بچے اپنی اپنی خواب گاہوں میں ہیں۔ابّو

!اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کے بعد میرے ذہن کے پردے پر اس وقت بھی صرف آپ کی شبیہ موجود ہے۔آج سے ستائیس سال پہلے میں سوچتی تھی کہ کاش آپ آجائیں اور مجھے اپنے ساتھ لے جائیں مگر اب میں سوچ رہی ہوں کہ ابّو کاش آپ ہوتے۔ میں اُس وقت آپ سے مشورہ کرتی۔آپ مجھے سمجھاتے۔میرا حوصلہ بڑھاتے۔لوگوں کی کم ظرفی کا اعلیٰ ظرفی سے جواب دینا سکھاتے۔آپ مجھے بتاتے کہ جب زندگی میں بے حس لوگوں سے واسطہ پڑ جائے تو اپنی حساسیت کو روگ نہیں بلکہ اپنی طاقت بناتے ہیں۔آپ مجھے اپنے حق کے لیے آواز اُٹھانا سکھاتے۔آپ مجھے فون کرتے، مجھے خط لکھتے مجھے محبت سے اپنے گھر بُلاتے۔آپ کے مُشفقانہ الفاظ،آپ کی تحریر اور میکے کی ٹھنڈی چھاؤں میری زندگی کے صحرا میں کسی نخلستان کی مانند ہوتیں۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں زندگی کے مشکل دور سے گُزر رہی ہوں آپ مجھے میری غلطیاں بتانے کے بجائے میری حوصلہ افزائی کرتے۔آپ کی طفل تسلّیاں مجھے چاند پر پہنچادیتیں۔زندگی جب جب دُکھوں اور مصائب کی چادر اوڑھتی آپ کی تسلّی کے دو بول میرا مان بڑھا دیتے۔جب دنیا اپنے دروازے مجھ پر تنگ کرتی آپ کا طاقتور وجود مجھے احساس دلاتا کہ ابھی واپسی کا راستہ موجود ہے۔اس وقت اگر آپ ہوتے تو شاید میرے سینے پر رکھی صبر کی سلِ کا بوجھ آپ نے بھی میرے ساتھ اُٹھایا ہوتا۔آج ادھیڑ عمری کی دہلیز پر عقل وشعور مجھے جو سُجھاتا ہے وہ اُس وقت سمجھ نہیں آتا تھا۔ماں باپ نہ ہونے کی وجہ سے میرے رشتوں کی دوڑ میں ایسی گرہیں لگ گئیں جو کبھی نہ کُھل سکیں۔کم عمری کی ناعقلی بڑی ظالم ہوتی ہے تمام عمر اس کی بازگشت سُنتے گزر جاتی ہے۔اکثر پرانے ملنے جلنے والوں سے آپ کا ذکر آج بھی سُننے کو ملتا ہے۔لوگ مجھے بتاتے ہیں کہ آپ ہمیشہ دوسروں کے مسئلے حل کرنے کو تیار ہوتے تھے۔اکثر لوگ آج بھی میرے ساتھ صرف اس لیے اچھی طرح پیش آتے ہیں کہ ماضی میں آپ نے ان کے ساتھ کبھی کوئی نیکی کی تھی۔کاش میں بھی آپ کا وہ روپ دیکھ پاتی۔اب عمر کے اس حصے میں بھی بڑی شدّت سے آپ کی یاد آرہی ہے۔میں چاہتی ہوں کہ میرے بوڑھے وجود کو آپ بڑے پیار سے اپنے کاندھوں پر اُٹھالیں۔میں آپ کی گردن میں اپنی بانہوں کے ہار ڈال دوں۔آپ کے کاندھے میں اپنا منہ چُھپالوں اور ایسے چُھپالوں کہ پھر مجھے کچھ اور نظر نہ آئے۔

میں اپنے عظیم والد کی دسویں بیٹی۔
آج ان کی اولادیں سب ڈاکٹر انجینئر ہیں۔

سیدہ لبنیٰ بینش امین

میرے والد محترم ایک انتہائی شفیق اور مہربان ہستی ہیں میں نے جب ہوش سنبھالا تو والدہ محترمہ اس جہان فانی سے کوچ کر چکی تھیں دس بہن بھائیوں میں سب سے آخری نمبر میرا تھا والد صاحب کے

کاندھوں پر گھر کی اور کسب معاش کی تمام تر ذمہ داریاں عائد تھیں۔

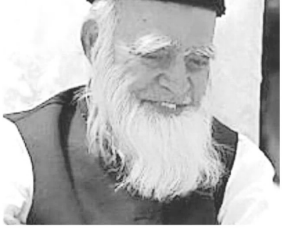

میں نے اپنے والد صاحب کو انتہائی سادہ اور اللہ پر توکل کرنے والا انسان پایا کبھی بھی کسی بھی حالات سے نہیں گھبرائے اور نہ ہی کبھی اپنی بیٹیوں کو بوجھ سمجھا۔

مجھے آج بھی اپنے اسکول کا پہلا دن یاد ہے جب ابا جان مجھے اپنے ساتھ سکول لے کر گئے میرا داخلہ کروایا اور مجھے پورا اسکول گھمایا میں کسی بھی صورت ان کا ہاتھ نہیں چھوڑ رہی تھی بڑی مشکل سے مجھے کسی بہانے سے کلاس روم میں بٹھایا کہ تھوڑی سی دیر بیٹھ کر دیکھو اگر مزہ نہ آیا تو واپس چلیں گے میں باہر ہی کھڑا رہوں گا، میں کلاس روم میں بیٹھ کر بار بار کھڑکی سے باہر دیکھ کر تسلی کرتی کہ ابا جان چلے تو نہیں گئے کچھ دیر کے وقفے سے باہر جھانکا تو ابا جان نہیں تھے میں بہت روئی رو رو کر پورا اسکول سر پر اٹھا لیا۔خیر اسی طرح کے کئی واقعات ہیں بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ آج کل کے دور میں لوگ ایک دو بیٹیوں کو بوجھ سمجھتے ہیں مگر اپنے گھر میں دسویں نمبر پر ہو کر بھی والد صاحب نے کبھی مجھے یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے گھبراتے ہیں۔یا تنگ ہیں۔

نو بیٹیوں کی شادی دھوم دھام سے کی بیٹیوں کے سسرال والوں کی مانگیں پوری کیں شادی کے بعد بھی تمام بیٹیوں کی مالی معاونت جاری رکھی

خاندان میں سب کی خبر گیری کرنا دور پار کے رشتہ داروں کی بھی خیر خواہی اور دل دہی کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا میرے ابا جان کی خاص خوبی ہے، اگر چہ ہم سب بیٹیاں والد صاحب کی اس فراخ دلانہ طبیعت پر اکثر معترض ہوتی ہیں مگر ابا جان کا ایک ہی جواب ہوتا ہے۔رشتہ داروں کو ان کا حق دو۔

میرے والد محترم وقت کے بہت پابند ہیں کھانے پینے،سونے جاگنے ہر کام کے لیے وقت متعین ہے اور ہم سب کو بھی ہمیشہ اسی بات کی تلقین کی کہ زندگی میں صحت اور کامیابی کا ایک ہی راز ہے کہ انسان ہر کام وقت پر کرے۔میرے والد صاحب انتہائی قابل اور کتاب دوست انسان ہیں میں ہمیشہ سے ان کو علمی و ادبی سرگرمیوں میں مصروف پایا۔اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت میں بھی کوئی کثر نہ چھوڑی اور آج ماشاءاللہ ان کی اولاد نواسے نواسیاں پوتیاں سب ڈاکٹر انجینئر ہیں اور زندگی کی دوڑ میں کامیاب ہیں اور اس کامیابی کا سہرا ہمارے والد محترم کے سر جاتا ہے۔میں اپنے ابا جان کی سب سے چھوٹی بیٹی ہوں تعلیم وتربیت شادی بیاہ کسی چیز میں والد صاحب نے کوئی کمی نہ رہنے دی مگر نصیب وہ واحد شے ہے جو باپ چاہ کر بھی اپنی بیٹی کے لیے نہیں خرید سکتا۔

میری شادی کامیاب نہ ہو سکی مگر میرے والد صاحب نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا عموما والدین بیٹیوں کو یہی درس دیتے ہیں کہ کچھ بھی ہو جائے سسرال میں گزارا کرو مگر میرے والد صاحب نے انتہائی روشن خیالی کا ثبوت دیتے ہوئے اور خاندان میں کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے نہ صرف میری خلع کے لیے عدالت میں مقدمہ کیا بلکہ رشتہ داروں کی طرف سے کی جانے والی مخالفت کا بھی ڈٹ کر مقابل کیا اور میری طرف آنے والے ہر تیر کو اپنے بازو پر روکا۔

ویسے تو میرے والد صاحب کے میرے اوپر بے شمار احسانات ہیں جن کو میں پوری زندگی نہیں چکا سکتی لیکن یہ ان کا احسان عظیم ہے کہ انہوں نے اتنے مشکل وقت میں بھی میرے سر پر اپنا دست شفقت رکھا اور دنیا کے ہر سرد وگرم سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اللہ پاک میرے پیارے ابا جان کا سایہ میرے سر پر ہمیشہ سلامت رکھے اور مجھے اس گھنی چھاؤں کی کماحقہ قدر کرنے کی توفیق دے آمین۔

بابا۔چاہے میں جتنی بڑی ہو جاؤں
آپ کی وہی لاڈلی بیٹی ہوں گی۔

نزہت جبین ضیا

میرا نام نزہت جبین ضیاء ہے۔کراچی سے تعلق ہے۔ادب سے لگاؤ وراثت میں ملا ہے۔جب ہوش سنبھالا تو اپنی دو

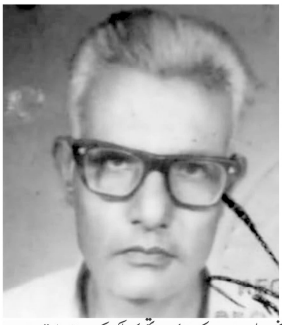

بڑی بہنوں کو افسانے لکھتے اور اپنے بابا، امّی کو تاریخی ناول پڑھتے دیکھا۔یہی وجہ تھی کہ لکھنے لکھانے کا شوق اور ادب سے گہری وابستگی گھٹی میں ہی ملی تھی۔اسکول کے زمانے سے ہی اردو سے خاص انسیت رہی۔۔مضمون نویسی اور تقاریر میں حصہ لیتی اور انعامات حاصل کئے۔اسکول کی بزم ادب کمیٹی کی نائب صدر تھی۔کلاس نائنتھ میں پہلا شعر

اُسے قریب سے دیکھا تو یہ ہوا محسوس
یہ شخص دُور سے اچھا دکھائی دیتا ہے

کہا اور پہلا افسانہ تیرہ سال کی عمر میں میٹرک کے بعد لکھا اور وہ شائع بھی ہوگیا۔ایف اے کے فوراً بعد شادی ہوگئی۔اس لئے شادی سے پہلے بہت کم لکھا۔گھرداری، میاں، بچے اور اپنی ذمے داریوں نے کئی سال کاغذ قلم سے مکمل طور پر ناطہ توڑے رکھا۔جب دوبارہ لکھنے کی پوزیشن میں آئی اور کاغذ قلم سنبھالا اور تقریباً گزشتہ پندرہ سولہ برس سے الحمدللہ مستقل بنیادوں پر تقریباً تمام مشہور ڈائجسٹوں جن میں آنچل، حجاب، نئے افق، پاکیزہ، دلکش، خواتین، شعاع، کرن، حنا، دوشیزہ، سچی کہانیاں، ریشم، نازنین، میں لکھا اور لکھ رہی ہو۔اس کے علاوہ تقریباً دو سال سے بچوں کی کہانیاں بھی

اخبارِ جہاں، انوکھی کہانیاں، جگنو، کرن کرن روشنی میں شائع ہورہی ہیں۔۔اس کے علاوہ" الحمدللہ محبتِ مصطفےٰ" کے عنوان سے ہونے والے مقابلے میں ایوارڈ اور سند اور نعت گوئی کے مقابلے میں سند مل چکی ہے۔

انٹرنیشنل رائٹرز فورم کی جانب سے، بلومنگ رائٹرز آرگنائزیشن پاکستان کی جانب سے ادبی خدمات پر شیلڈز اور سرٹیفکیٹس ملے ہیں۔۔سچی کہانیاں میں کہانی پر سند مل چکی ہے۔2023 میں کراچی میں صادقین آرٹ گیلری میں کیلی گرافی کے مقابلے میں شرکت کی اور صادقین آرٹ گیلری میں میری پینٹنگ لگائی گئی اور تعریفی سند سے نوازا گیا۔۔میرے چھپے ناولوں کی ایک کتاب "محبت اب بھی باقی ہے" کے عنوان سے شائع ہوچکی ہے۔۔

اپنے کسی بھی پیارے رشتے کے حوالے سے، ہم عموماً ایک بات بار ہا سنتے اور پڑھتے ہیں کہ میرے بابا امّی بھائی بہن۔ دنیا کے سب سے اچھے باپ، بہن، بھائی، ہیں۔۔بے شک یہ جملہ زبان ذدِعام ہے۔۔۔۔لیکن میرے لئے یہ جملہ محض ایک عام سا جملہ نہیں۔۔میرے لئے میرے "بابا" کے حوالے سے اس جملے میں دنیا بھر کی سچائی ہے، میرے جذبات، میری سوچ، میرے الفاظ شاید میرے ذہن کی ترجمانی نہیں کرسکتے۔۔کہ میرے "بابا" میرے لئے کیا تھے۔۔؟؟اگر بابا اور اپنے حوالے سے لکھنے بیٹھوں تو شاید ساری رات گزر جائے۔۔

میرے بابا محمد عبدالمنان کا تعلق حیدرآباد دکن سے تھا۔انڈیا کی فٹ بال ٹیم میں میرے بابا دو چچا اور ایک تایا کھیلتے تھے۔۔

بقول امّی کے جب بابا پاکستان آئے تو دوسرے ہی دن بابا کو کے ایم سی میں فٹبال پلیئر ہونے کی وجہ سے اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ میں جاب مل گئی۔۔بابا انتہائی محنتی، ایمان دار اور نیک انسان تھے۔۔وہ ساری زندگی ایسی سیٹ پر بیٹھے جہاں رشوت خود چل کر آتی۔۔چھ بیٹیاں اور صرف ایک بیٹا، حالات نامساعد بھی رہے۔مگر بابا ہمیشہ ثابت قدم رہے اور اللہ پر توکل کیا۔۔

عموماً گھرانوں میں سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے بچے کو اہمیت دی جاتی ہے۔اس حوالے سے بہن بھائی میں میرا نمبر پانچواں تھا۔۔تین بڑی بہنیں اور ایک بھائی کے بعد ایسے بچے وہ توجہ حاصل نہیں کرپاتے لیکن۔۔۔۔۔میں وہ خوش نصیب بچی تھی کہ "بابا" کی خصوصی توجہ حاصل رہی۔۔شاید اس وجہ سے کہ میں الحمدللہ بچپن سے ذہین اور ایکسٹرا شارپ تھی۔۔شرارتی تھی۔حاضر جواب تھی۔فطرتاً نازک مزاج بھی تھی۔۔

بابا نے ہمارے ساتھ ہمیشہ دوستانہ ماحول رکھا۔ہم بابا کے ساتھ بیٹھ کر تاش، کیرم، مونا پلی اور اسکریبل کھیلتے۔۔بابا نے کبھی بھی کسی نقصان پر ڈانٹا نہیں۔۔

ہماری پڑھائی پر بابا ہمیشہ خود توجہ دیتے۔۔بابا کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ الحمدللہ ان کو اپنی تربیت پر مکمل اعتماد اور بھروسہ تھا۔کبھی بھی ہم پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔جہاں بیٹیاں زیادہ ہوں وہاں والدین پریشان رہتے ہیں۔۔لیکن ہمارے "بابا" ہمیشہ مطمئین اور اللہ پر شاکر رہے۔۔اور الحمدللہ سرخرو رہے۔۔

آج میں ادب کے جس مقام پر ہوں۔۔اس میں سب سے بڑا ہاتھ میرے بابا کا ہے۔میرا پہلا افسانہ جب چھپا ہوا تو اس وقت مجھے امّی، بابا سے بہت ڈر لگ رہا تھا کیونکہ میں صرف تیرہ سال کی تھی۔۔لیکن نہ صرف "بابا" نے وہ افسانہ پڑھ کر میری حوصلہ افزائی کی بلکہ اس کی خامیاں بھی بتائیں۔یہی حوصلہ، اعتماد اور مان، ہی تو تھا جس نے ایک چھوٹی بچی کو حوصلہ بخشا اور آج وہ کسی قابل ہوئی۔۔میرے "بابا" میرے لئے کیا ہیں میں کہہ نہیں سکتی۔

آج الحمدللہ میں عمر کی لمبی مسافت طے کرچکی ہوں۔۔لیکن مجھے آج بھی ہر قدم پر، ہر موقع پر "بابا" کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔۔

"بابا" چاہے میں جتنی بڑی ہوجاؤں آپ کی وہی لاڈلی بیٹی رہوں گی۔جو آپ کے کاندھے سے لگ کر اور آپ کے بازو تھام کر آنکھیں موند لیتی تھی۔۔۔۔۔۔کتنے پرسکون، کتنے آسودہ اور راحت افزاء تھے وہ پل۔۔۔۔۔

میں جانتی ہوں وہ پل کبھی واپس نہیں آئیں گے۔۔۔۔۔بابا آپ نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے۔۔مجھے یقین ہے کہ آپ وہاں پر، بہت اچھی جگہ پر ہوں گے۔۔کیونکہ آپ جیسے لوگ اللہ کے بھی پسندیدہ ہوتے ہیں۔۔

اللہ پاک میرے "بابا" کے درجات بلند کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین ثم آمین

اباجی کا خزانہ۔نادر کتب۔ہمارے پاس ہیں۔
ان کا عرس ہر سال 20 نومبر کو منایا جاتا ہے۔

اقتدار جاوید

قبلہ والد کا کتب خانہ پرانے زمانے کے ایک رنگلے صندوق میں بند تھا۔کتابوں کا ایک بھرا پڑا صندوق تھا وہ وہاں سے اپنی پسند کی کتاب کس طرح ڈھونڈ لیتے تھے معلوم نہیں۔وہیں ان کے مسودے بھی پڑے ہوتے تھے۔وہ بہت خوش نویس تھے اور

گر تو می خواہی کہ باشد خوش نویس
می نویس و می نویس و می نویس

والا شعر انہی سے ہم نے بچپن میں سنا تھا اور یادداشت کا حصہ بنایا تھا۔اس صندوق میں ہم نے اردو، عربی اور فارسی کی کتب دیکھیں مگر کوئی پنجابی کتاب نہیں دیکھی سوائے قصیدہ غوثیہ کے منظوم ترجمہ کے جو محمد ابراہیم نامی شاعر نے کیا تھا۔یہ پاکٹ سائز کتابچہ تھا۔قبلہ والد کی ایک عادت ثانیہ یہ بھی تھی دوران مطالعہ جو جملہ جونکتہ پسند آتا اس صفحے اور اس سطر پر اپنے دستخط کرتے اور تاریخ ضرور لکھتے۔دستخط بھی کیا تھے پورا نام ہی لکھ دیتے تھے۔

اباجی کی کتب کا خزانہ بہت منتخب قسم کا تھا الا بلا قسم کی کوئی شے نہیں تھی۔وہ مذہبی شخصیت تھے مگر اولاد کو مذہبی مجادلے والی کتب سے کوسوں دور رکھا۔خود بھی مسلکی شدت پسندی سے نالاں تھے۔پرانی تہذیب اور وضع کے مطابق زندگی بھر گھر کو دو حصوں میں منقسم کیے رکھا ایک زنان خانہ اور دوسرا مردان خانہ۔کتب ان کی زنان خانے میں ہوتی تھیں اپنے مطالعے کے لیے ایک آدھ کتاب اپنے پاس رکھتے۔حنفی بریلوی ہونے کے باوجود مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ کردہ قرآن مجید زیر مطالعہ رہتا تھا۔

الف لام میم سے والناس تک
دنیا میرے ذوق کی عرفان کی

ایک آدھ اور کتاب جیسے دیوان غالب یا دیوان حافظ۔
جہاں ان کو کوئی شعر پسند آتا وہیں دستخط کر دیتے۔

قبلہ والدؒ نے اپنی کہی ہوئی نعتوں کا مجموعہ ترتیب دیا اور پہلی اشاعت پذیرود کتب بہار خلد اور گلشن قادری (نبی کریم ﷺ کے معجزات) سے نعتیں الگ کر لیں اور منے کلام اور ان دو کتب میں شامل نعتیں بھی اسی زیر ترتیب مجموعہ میں شامل کر لیں۔ کتابت کے لیے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ایک خوش الطوار نوجوان کاتب بادشاہ پور آستانے پر پہنچ گیا۔ وہ علی الصبح قبلہ کی نشست کے ساتھ جائے نماز بچھا کر کتابت کرتا۔ ایک دو ماہ میں وہ کتابت مکمل کر کے واپس چلا گیا۔ اس نوجوان کاتب کو بڑے بھائی تو قیر احمد فائق نے بھیجا تھا اور انہوں نے ہی کتابت کی ادائگی بھی کی تھی۔ تب وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ڈپٹی کمشنر تعینات تھے۔ اب اس مجموعے کا نام تجویز کرنے کا مرحلہ آیا تو قبلہ نے وَرَفَعنَالَکَ ذِکرَکَ تجویز کیا۔

ہمیں بھی یہ نام بہت پسند آیا۔ چند دن بعد قبلہ نے اس نعتیہ مجموعے کا نام خزینہ رحمت" رکھ کر کتاب پرنٹنگ کے حوالے کر دی۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ پہلے والا نام کیوں تبدیل کیا۔ خاموش ہو گئے ہم نے از خود اندازہ لگایا اور استفسار کیا تب فرمایا میں کون ہوتا ہوں رحمت العالمین ﷺ کا ذکر بلند کرنے والا۔ میں یہ نام رکھنے کا سزاوار کہاں۔ یہ بات اللہ کر سکتا ہے صرف اللہ۔ این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!!

شوکت بک ڈپو شاہدولہ چوک گجرات کسی زمانے میں ضلع گجرات میں مذہبی اور عشقیہ داستانوں کی اشاعت کا مرکز تھا۔ ان کی تصنیف مرزا صاحباں کا تو الگ ہی چرچا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 1968 میں شوکت بک ڈپو گجرات نے ہی دوسری بار شائع کیا تھا۔ اس کتاب کے سرورق پر ایک خوبرو نوجوان اور ایک پنجابی مٹیار کی تصویر دیکھ کر ہی ہم نے مرزا صاحباں کی خیالی تصویر بنائی تھی۔ اس کا آخری ایڈیشن لہراں ادبی بورڈ والے سید اختر حسین نے بڑی محبت سے شائع کیا تھا۔ اس کی تیسری اشاعت سے قبل ہم باپ بیٹا اردو بازار کے ایک مشہور پبلشر کے پاس آئے تھے۔ ہم مرزا صاحباں ان سے چھپوانا چاہتے تھے۔ پنجابی ادب کے رسیا اور شائق اس تصنیف کو معرکتہ الارا مانتے ہیں۔ جب اردو بازار پہنچے تو ان کو گاڑی میں بیٹھے کو کہا اور خود پنجابی کتب کے مشہور پبلشر کی دوکان پر چلا گیا۔ سلام دعا کے بعد اپنی آمد کا مقصد بتایا کہ کتاب مرزا صاحباں شائع کروانی ہے۔ پبلشر فوراً بولا مرزا صاحباں اسیں صرف حافظ برخوردار، بوٹا گجراتی اور سراج قادری (قبلہ والد) کا شائع کرتے ہیں۔ اس سے بات چیت کر کے واپس آیا اور خوش ہو کر ان کو سارا قصہ گوش گزار کیا۔

آہستہ سے کہا "اچھا"۔ وہ کتاب بعد میں لہراں ادبی بورڈ نے شائع کی۔ مقصود ثاقب نے ان کے انتقال پر ماں بولی کا سراج قادری نمبر شائع کیا اور ان کی تصنیف سوہنی مہینوال سے منتخب کلام ماں بولی میں شائع کیا۔ میں جب بھی قبلہ کی کافیاں یا دوسرا کلام 'ماں بولی' کے لیے بھیجتا تو مدبر اہتمام سے آفسٹ پیپر پر ان کا کلام شائع کر کے پرچے کی زینت بناتے تھے۔ سید سبط الحسن ضیغم جیسے کھوج کار ان کے پاس حاضر ہوتے تھے۔

ان کے کتب خانے میں نادر مخطوط جات بھی تھے جو فارسی اور عربی زبانوں میں تھے۔ حکومت پنجاب اور قومی عجائب گھر نے باقاعدہ درخواست کر کے وہ مخطوطے منگوا لیے تھے۔ ان کی درخواست کے جواب میں قبلہ نے جوابی خط میں یہ ضرور لکھا کہ ان مخطوطوں کی ملکیت میری ہے اور ارسال کنندہ یا تحفہ دہندہ کا نام ضرور لکھا جائے۔ یہی ان کی کمائی تھی۔ ان کی مذہبی خدمات کی بنا پر ان کے مریدان ہر سال کی بیس نومبر کو بادشاہ پور منڈی بہاؤالدین میں ان کا عرس مناتے ہیں۔

ابا جی کی کتابوں کا بہت سارا خزانہ تقسیم ہو گیا۔ گروہ کتب جو ان کو جی جان سے عزیز تھیں اور جن سے وہ تارتار بندھے ہوئے تھے وہ ہم نے سنبھال لیں۔ ان میں مطالب الغالب نسخہ فقیر سہارا، دیوان حضرت علیؓ، دیوان حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ اور تصوف کی ایک نادر کتاب۔ ان کے علاوہ ان کی ساری شائع شدہ چھوٹی بڑی اٹھائیس کتب کا ایک ایک نسخہ اور تمام غیر مطبوعہ کلام اب ہمارے پاس محفوظ ہے۔ قبلہ کی یہی کل کمائی تھی یہی کل اثاثہ تھا جو قسمت نے یاوری کی اور ہمارے حصے میں آ گیا۔ کتاب نے اسی کے پاس جانا تھا جسے کتاب سے محبت تھی۔

میرے والد بڑے شاعر ہی نہیں بڑے انسان اور اچھے باپ تھے۔

❁ رُکو انور۔ محسن بھوپالی کی صاحبزادی

بچہ جس گھر میں آنکھ کھولتا اور بڑا ہوا ہے وہ اس کے والدین کا ہوتا ہے۔ ماں کی اہمیت اپنی جگہ مگر باپ ایک سائبان ہوتا ہے۔

ہمارے والد نے ایک مشہور آدمی ہونے کے باوجود تعلیم و تربیت میں امّی کے ساتھ ایک ایسے گھرانے کی تعمیر کی جس میں محبت، خلوص، سچائی، خودداری اور قناعت کی اینٹیں لگائیں۔

وہ ایک بڑے شاعر ہی نہیں ایک بڑے انسان اور اچھے باپ بھی تھے۔ انھوں نے زندگی گزارنے کے سادہ اصول بتائے کہ اپنی قابلیت پر بھروسہ رکھو، محنت کرو، صبر و سکون سے حالات کا مقابلہ کرو، یہی وجہ ہے یہ خوبیاں ہم بہن بھائیوں میں جھلکتی ہیں۔

۔خودداری انکا خاص وصف تھا۔۔ ہم نے ان کو کبھی فالتو باتیں کرتے نہیں دیکھا۔۔ نہ ہی بے کار سیاسی و مذہبی بحث یا کسی کی غیبت چغلی نہ ہی کسی شاعر ادیب کی برائی۔ ان کی چمکدار ذہین آنکھیں ہمہ وقت سوچتی رہتیں۔ بچّوں سے نوجوانوں سے ان کی دلچسپی کی باتیں اور بڑوں سے انکی۔ کسی پر کبھی اپنی قابلیت اور رائے نہیں تھوپتے، ہر ایک کی سُنتے ۔۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے خاندان اور ادبی حلقوں، دوست احباب میں آج بھی ہر دلعزیز ہیں اور ان کا نام عزت سے لیا جاتا ہے ۔۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے۔

مجھے وہ پیار سے رُکو کہتے تھے اسی وجہ سے یہ نام مجھے پیارا ہے اسی نام سے لکھتی ہوں۔

میں لفظوں کے اثر کا معجزہ ہوں
مجھے دیکھو میں مجسّم دُعا ہوں
مری فطرت ہے آہستہ خرامی
میں اپنے قافلے سے رہ گیا ہوں

(محسن بھوپالی) ❁

ہر باپ عظیم۔لائق تعظیم۔آئندہ کی اشاعتوں میں

آئندہ اشاعتوں کے لیے محفوظ جذبات۔ معذرت خواہ ہیں کہ اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے مگر محبت سے پُر تحریریں بہت عقیدت سے پڑھی جا رہی ہیں۔

نازیہ آصف (گجرات)۔ شاہ ولی اللہ خیری (کراچی)۔ عدنان عباسی (کنڈیارں)۔ حکیم عمار وحید۔ سیدہ عطیہ حسن عابدی (کراچی)۔ ڈاکٹر رضوانہ انصاری (حیدر آباد)۔ پروفیسر سیما ناز صدیق (کراچی)۔ سحر محمود (ملتان)۔ فرخ شہزاد (کوئٹہ)۔ جنید فریدی (کراچی)

اگر آپ نے تحریر ارسال کی ہے۔ ابھی شائع نہیں ہوئی۔ اس فہرست میں بھی نام نہیں ہے۔ تو براہ کرم واٹس ایپ کریں۔

0300-8210636

مال گاڑی میں امانتیں۔اطراف مطبوعات

”اطراف‘ مطبوعات کو فخر ہے کہ ایک انتہائی منفرد تحقیقی کتاب ’مال گاڑی میں امانتیں‘شائع کرنے کا شرف حاصل ہوا۔اس کی رونمائی کی تقریب 13 اگست کو پاکستان آرٹس کونسل کراچی کے زیر اہتمام حسینہ معین ہال میں منعقد ہوئی۔ صدارت پاکستان کے سابق چیف جسٹس انور ظہیر جمالی نے کی۔ مقررین میں ڈاکٹر سید جعفر احمد۔ بیرسٹر عابد زبیری۔ اسد اللہ شاہ راشدی ایڈووکیٹ ۔ محمود شام۔ رمضان چھیپا اور مصنف محمد حنیف بندھانی شامل تھے۔ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مہر شاہ راشدی ایڈووکیٹ نے بہت باکمال نظامت کی۔ حمد و نعت بھی بہت عقیدت سے پیش کی ۔ مقررین کو سندھ کی سوغات اجرک اور رجناح کیپ کا تحفہ پیش کیا گیا۔“

چوہدری محمد اسماعیل نے دس سال حق کی خاطر جدوجہد کی

اطراف رپورٹ

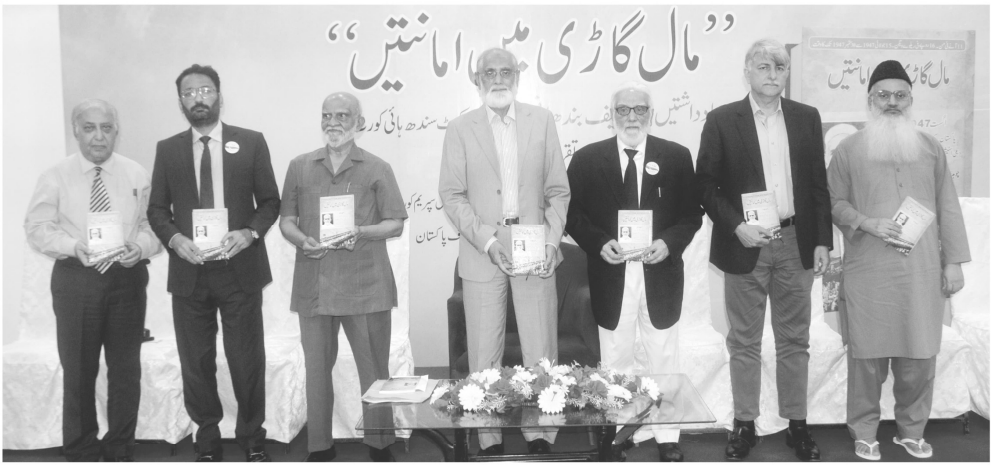

سابق چیف جسٹس۔جسٹس (ر) انور ظہیر جمالی کا خطاب

میرے لیے یہ ایک اعزاز کی بات ہے کہ آج کی اس تقریب میں مجھے شرکت کی دعوت دی گئی۔ اور اس طرح 1947 میں تقسیم ہند کے حوالے سے ایک نئی تصنیف ”مال گاڑی میں امانتیں“ کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا گیا۔

یوں تو 14 اگست 1947 کا دن پاکستان کی یوم آزادی کے حوالے سے ہماری تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل ہے مگر آج بھی نئی نسل کو اس بارے میں آگاہ کرنا بہت ضروری ہے۔ یوں تو اس سلسلے میں اگر ہزاروں نہیں تو کم از کم سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔جس میں نہ صرف عمومی طور پر تفصیل سے اس ظلم و زیادتی اور دردانگیز واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جس میں دس لاکھ سے زائد لوگ، جن میں بے شمار خواتین اور بچے بھی شامل تھے لقمہ اجل بن گئے اور اس کے علاوہ ہماری لاکھوں ماؤں بہنوں بیٹیوں اور دیگر خواتین رشتہ داروں کی عزت کو داغدار کیا گیا مگر انہی تصانیف میں کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جو اس سارے ظلم و زیادتی کے چشم دید گواہوں نے اپنے خصوصی واقعات کے حوالے سے تحریر کی ہیں۔

آج کی کتاب بعنوان ”مال گاڑی میں امانتیں“ بھی اسی قسم کی ایک کاوش ہے جو محمد حس لیف بندھانی ایڈووکیٹ نے اپنے مرحوم والد چوہدری محمد اسماعیل صاحب کی یادداشتوں کی بنیاد پر تحریر کی ہے اور ان کے ساتھ ہونے والی نا انصافی اور زیادتی کا احاطہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا

ہے کہ کس جواں مردی سے انہوں نے اپنے اور دوسرے متاثرین کے حق کی خاطر نو دس سال جدوجہد کی۔

اس کتاب کا طائرانہ جائزہ لینے پر آپ دیکھیں گے کہ حنیف بندھانی ایڈووکیٹ نے نہایت صاف گوئی اور اختصار کے ساتھ ان واقعات کو کتاب کے شروع کے 23 صفحات پر ضبط تحریر کیا ہے اور اس کے بعد صفحات نمبر 45 تا 137 میں ان ساری دستاویزات کو پیش کیا ہے جو اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔اس کے علاوہ مختصر ان باتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو آپ کے والد اور دیگر افرادِ خانہ نے تقسیمِ ہند کے بعد کراچی میں فلاحی کاموں کے سلسلے میں حصہ لیا ہے۔

''مال گاڑی میں امانتیں'' جس کے بارے میں ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں۔ دراصل ہولناک واقعات کا ادراک ہوگا۔ ورنہ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ صرف 96,95 ہزار روپے کی خاطر نو دس سال جدوجہد کرنا نادانی تھی۔ اگر دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ چوہدری محمد اسماعیل صاحب مرحوم کی جنگ حق و انصاف کی خاطر تھی اور اس کے متاثرین پچاسیوں افراد تھے۔ اور 96,95 ہزار کی رقم اس زمانے کی بات ہے جب اسٹیبلشمنٹ ڈیپارٹمنٹ سے حق داران کو 500 یا 600 روپے میں دکانیں اور 5 یا 10 ہزار میں مکان الاٹ ہوتے تھے۔

اسی کتاب کے حوالے سے میں جناب محمود شام کے تحریر کردہ پیش لفظ کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے نہایت اختصار سے اس کتاب کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔

آخر میں، میں محمد حنیف بندھانی ایڈووکیٹ صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے اپنے والد کی یادداشتوں کو اس کتاب کی شکل دی اور ایک ایسے واقع منظر عام پر لائے جو نئی نسل کے لیے سبق آموز اور مشعلِ راہ ہوگا۔ بہت بہت شکریہ۔

''مال گاڑی میں امانتیں'' ڈاکٹر سید جعفر احمد کا خطاب

محمد حنیف بندھانی صاحب اور محترم محمود شام کی مرتب کردہ کتاب 'مال گاڑی میں امانتیں' جس پر گفتگو کے لیے آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں، ایک بہت مختصر سی کتاب ہے لیکن اپنی معنویت اور تاریخی اہمیت کے حوالے سے یہ کئی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔ تقسیمِ ہند کے دوران بندھانی صاحب کے والد چوہدری محمد اسمٰعیل جو کیریج کنٹریکٹر کا کام کرتے تھے، کس طرح سرکاری ملازمین کے زیرِ استعمال ذاتی فرنیچر، دیگر متعلقات اور کاغذات لے کر دہلی سے کراچی پہنچے، اور اس پوری ذمہ داری کے کام میں انہیں کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، نیز پاکستان پہنچنے کے بعد ان امانتوں کو ان کے مالکوں تک پہنچانے اور پھر اپنے مختانے کی رقم وصول کرنے کے لیے کن آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا، بظاہر یہ تقسیمِ ہند کا ایک بہت ہی چھوٹا سا واقعہ ہے مگر اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس واقعے کی تفصیلات کو ایک بڑے کینوس پر پھیلا کر دیکھیں تو ان سے اتنا بہت کچھ ہمیں تقسیم ہند اور بعد از تقسیم کے حالات کی بابت غور و فکر کا سامان میسر آجاتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم بیسویں صدی میں سیاسی طور پر مجسم ہونے والے ہندو مسلم تضاد کے حل کا ایک نسخہ تصور ہوا تھا۔ بظاہر یہ قانونی اور سیاسی راستے سے ہندو مسلم تقسیم کو حل کرنے کے قائداعظم محمد علی جناح اور مسلم لیگ کے مختلف اوقات میں پیش کیے جانے والے فارمولوں کا کانگریس کی جانب سے مستقل طور پر رد کیے جانے کے بعد، ایک واحد راستہ بچا تھا۔ لیکن تقسیمِ ہند اپنے ساتھ جس قسم کے سانحات لے کر آئی ان کا شاید کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا۔ بنیادی طور پر یہ استعماری حکومت کا فرض تھا کہ وہ تقسیم کے عمل کو خوش اسلوبی کے ساتھ طے کروائی لیکن اپنے اس فرض کی ادائیگی میں یکسر ناکامی کے نتیجے میں ہندوستان کو تاریخ کے تلخ ترین تجربات کا سامنا کرنا پڑا۔ چالیس کروڑ انسانوں پر مشتمل برصغیر کی تقسیم قانونی اور انتظامی راستوں سے پایہ تکمیل تک پہنچنے کے بجائے ایک افسوس ناک عملِ جراحی (Cesarean operation) کی صورت میں روبہ عمل لائی گئی، جب باؤنڈری کمیشن کے ارکان نے ہیلی کاپٹر پر بیٹھ کر پنجاب کے اضلاع کو دائیں بائیں تقسیم کرنے کا کام کیا۔ تقسیمِ ہند ایک کروڑ بیس لاکھ انسانوں کی نقل مکانی پر منتج ہوئی۔ دس لاکھ انسانوں کا قتل ہوا۔ ٹرینوں کے اندر، پٹریوں پر، پلیٹ فارموں پر، کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر لاشیں انسان کی بے توقیری کی منہ بولتی تصویر بن گئیں۔ ہزاروں خواتین اغواء ہوئیں، جان بچاتی ہوئی عورتوں کی لاشیں سرحد کے دونوں طرف کنوؤں میں پائی گئیں۔ آبروریزی کے کتنے واقعات ہوئے، اس سب کا حساب کتاب شاید کبھی نہ کیا جاسکا۔ تقسیمِ ہند کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ یہ ہندوستان اور پاکستان کو لامتناہی دشمنی کے ایک ایسے گرداب میں پھنسا کر گیا جس سے نکلنا آج تک ممکن نہیں ہوسکا۔ دلیپ ہائرو (Dilip Hiro) نے تو اپنی کتاب کا نام ہی 'The Longest August' رکھ چھوڑا، یعنی ۱۹۴۷ء کا

گست آج تک چلا آرہا ہے، ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔

تقسیمِ ہند کی تفصیلات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جہاں زمین تقسیم ہوئی، قصبے اور دیہات تقسیم ہوئے، دریاؤں کی تقسیم ہوئی، فوجی ساز و سامان تقسیم ہوا، مالی اثاثوں اور کتابوں اور لائبریریوں کی تقسیم ہوئی وہیں سرکاری ملازمین سے بھی پوچھا گیا کہ وہ سرحد کے اِس پار رہنا چاہتے ہیں یا اُس پار؟ اس نقل مکانی کے ساتھ ہی ملازمین کے ذاتی اثاثے، ان کا فرنیچر، ان کے کاغذات اور فائل، سب ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچائے گئے۔ ہندوستان سے پاکستان آنے والے افسروں اور دیگر سرکاری ملازمین کی اشیائے استعمال اور کاغذات جو پاکستان تک پہنچائے گئے اسی نقلِ مکانی کی کچھ تفصیلات دستاویزات کی شکل میں زیرِ نظر کتاب میں جمع کی گئی ہیں۔ یہ سب دستاویزات پہلے کیرج کنٹریکٹر چوہدری محمد اسمٰعیل نے اور ان کے بعد ان کے صاحبزادے محمد حنیف بندھانی نے سنبھال کر رکھیں۔ خوش قسمتی سے یہ پورا اثاثہ محمود شام صاحب کے علم میں آیا جو تاریخی چیزوں کی اہمیت کے حوالے سے نہ صرف گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ تاریخ سے حاصل کردہ بصیرت سے اپنے حال کی تفصیل بھی بیان کرنے کی استطاعت

رکھتے ہیں۔’مال گاڑی میں امانتیں‘ کچھ تو اپنے مالکان کی امانتیں تھیں لیکن یہ پاکستانی قوم کی بھی امانتیں تھیں اور اس قوم کو یہ امانت پہنچانے کا قومی فریضہ محمود شام صاحب سرانجام دے رہے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی شک نہیں کہ یہ اس یوم آزادی پر قوم کو دیا جانے والا سب سے اہم تحفہ ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے وقت ایک ذاتی حوالہ بھی ذہن میں اجاگر ہوا۔ اتفاق سے میرے والد بھی جو سرکاری ملازم تھے، تقسیمِ ہند پر دہلی سے پاکستان منتقل ہوئے۔ وہ زیادہ تر پنجاب کے مختلف شہروں میں تعینات ہوتے رہے۔ کبھی کیمبل پور، کبھی راولپنڈی، کبھی کھیوڑہ، کبھی میانوالی، اور بعد میں کراچی اور پھر ریٹائرمنٹ کے وقت کوئٹہ۔ آزادی کے دس سال بعد جب میں ان کا شریکِ سفر ہوا تو اپنی کم سنی کے زمانے میں، میں دیکھتا تھا کہ ہمارے گھر میں فرنیچر کی دو تین چیزیں تھیں جن کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ یہ والد کے ساتھ دہلی سے یہاں آئی ہیں۔ کچھ پرانے کاغذات اور فائل بھی تھے جنہیں دیکھنے کا موقع مجھے بڑے ہونے پر ملا۔ ان کے کاغذات ہی میں مجھے وہ سہرا بھی ملا جو ان کی شادی میں زلف علی نامی اُن کے دوست نے لکھا تھا۔ والد نے ان چیزوں کو ہمیشہ سونت کر رکھا تھا۔ پرانا صوفہ جو انہیں بہت عزیز تھا وہ ۱۹۷۷ء میں کراچی کی بارشوں میں اُس وقت تباہ ہوا جب پانی گھروں میں داخل ہوا۔ میں اکثر یہ سوچتا تھا کہ یہ چیزیں ہندوستان سے پاکستان کیسے آئی ہوں گی۔ یہ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوا کہ یہ بھی کسی کیریج کنٹریکٹر کے توسط سے یہاں پہنچی ہوں گی۔ کتنی ہی انفرادی مثالیں ہوں گی جو ماضی سے ہمارے رشتے کو جوڑ کر رکھنے کا ذریعہ بنی رہی ہیں۔

کتاب کی اہمیت وہی سمجھ سکتا ہے جسے 1947 کے ہولناک واقعات کا ادراک ہوگا۔جسٹس (ر) انور ظہیر جمالی

’مال گاڑی میں امانتیں‘ کن پہلوؤں کو ہمارے حاشیہ خیال میں زندہ کرتی ہیں؟ پہلی بات تو یہ کہ ہمارا ذہن خود تقسیمِ ہند کی بدانتظامی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی خیال ذہن میں آتا ہے کہ اُس صورت حال میں جس کا مجموعی منظر نامہ تو بہت تکلیف دہ تھا، یہ بات کم از کم قابلِ ذکر ہے کہ بعض محکموں میں چیزیں باقاعدہ منظم طریقے سے کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ سرکاری ملازمین کے اثاثوں کو منتقل کرنے کے لیے ٹینڈر طلب کرنا، تین چار دن کے اندر اندر ٹینڈرز کا فیصلہ کرنا، دوسرے محکموں سے بجٹ کی منظوری اور سامان کی ترسیل کے لیے ٹرکوں اور ریل گاڑیوں کا انتظام، یہ سب چیزیں بہرحال ہنگامی حالات میں ہورہی تھیں۔ بدقسمتی سے پاکستان بننے کے بعد ہم نے بحرانی کیفیات میں ہیجان انگیز فیصلے کرنے کی روایت تو برقرار رکھی لیکن محکمہ جاتی سطح پر اچھی روایات بھی ایک ایک کرکے تباہ کردی گئیں۔ ہم دیکھتے آئے ہیں کہ سیلاب آئیں یا طوفان یا اور کوئی سیاسی بحران ہو ہماری ریاست کے پاس ان سے عہدہ برآ ہونے کے نہ تو وسائل ہوتے ہیں نہ ان کے پاس طرزِ حکمرانی کی وہ خوبیاں ہیں جن سے مسائل سے نمٹنا ممکن ہوسکے۔ ہم نے ہر بحران کو بدسلیقگی سے نمٹانے کی کوشش کی ہے، اور اس عمل میں بارہا قومی سانحوں سے بھی دوچار ہوئے ہیں۔ وہ محکمے جن کا متحدہ ہندوستان میں کارکردگی کا اچھا ریکارڈ تھا، مثلاً ڈاک اور تار کے محکمے یا ریلوے کا نظام، وہ سب بھی ماضی کی یادبن کر رہ چکے ہیں۔

موجودہ کتاب میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ٹینڈرز میں کس قسم کی شرائط رکھی گئی ہیں، کن کن پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، کن کن چیزوں کو مشروط کیا گیا ہے۔ اس سب کے باوجود پاکستان بننے کے بعد ہماری افسر شاہی نے استعماری دور کے ناز و نعم اور رعب و رعونت کو تو برقرار رکھا لیکن جو خوبیاں اس نظام میں تھیں ان کو نظر انداز کرنے میں بھی دیر نہیں لگائی۔

زیرِ نظر کتاب اس پہلو کی طرف بھی ہمیں متوجہ کرتی ہے کہ ہم اپنی تاریخی اہمیت کی دستاویزات کو کس حد تک محفوظ کرسکے ہیں۔ شمس الحسن صاحب جو مسلم لیگ کے آفس سیکریٹری تھے وہ سینکڑوں

جناب رمضان چھیپا کو اجرک اور جناح کیپ پیش کی جارہی ہے

فائل کسی نہ کسی طرح پاکستان لے کر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ برسوں وہ فائل گودام میں اِدھر اُدھر پڑے رہے۔ بہرحال کراچی یونیورسٹی میں ان کو کسی طور محفوظ کیا گیا، ان میں سے بھی بہت سے کاغذات اسلام آباد منتقل کیے گئے۔ اب جو یہاں موجود ہیں ان کی حالت دیکھیں تو افسوس

پاکستان کے 78ویں یوم آزادی پر کیک کاٹنے کی تقریب

ہوتا ہے۔ انگریز کے زمانے سے ہمارے یہاں سرکاری فائلوں کو آرکائیوز کی شکل میں محفوظ کرنے کا کام شروع ہوچکا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد سندھ سے متعلق بیشتر فائل کراچی میں جمع کیے گئے لیکن ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ بننے پر ان کو لاہور بھیج دیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں ون یونٹ کے

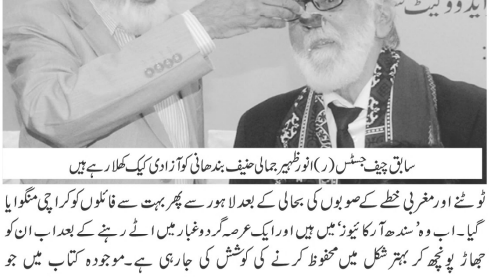

سابق چیف جسٹس (ر) انور ظہیر جمالی حنیف بندھانی کو آزادی کیک کھلا رہے ہیں

ٹوٹنے اور مغربی خطے کے صوبوں کی بحالی کے بعد لاہور سے پھر بہت سے فائلوں کو کراچی منگوایا گیا۔ اب وہ ’سندھ آرکائیوز‘ میں ہیں اور ایک عرصہ گرد و غبار میں اٹے رہنے کے بعد اب ان کو جھاڑ پونچھ کر بہتر شکل میں محفوظ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ موجودہ کتاب میں جو

دستاویزات یکجا کی گئی ہیں یہ بیشتر خط وکتابت ہیں جو چوہدری محمد اسمٰعیل صاحب اور مختلف محکموں کے درمیان ہوئیں۔ ان اہم کاغذات کا ضائع ہوجانا عین ممکن تھا بلکہ ان کو دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی کہ یہ ضایع ہونے سے رہ کیسے گئیں؟ اسمٰعیل صاحب اور ان کے صاحبزادے لائق مبارک باد ہیں کہ انہوں نے ان کو محفوظ رکھا اور محمود شام صاحب کی ایماء پر یہ کتاب کی شکل میں آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہورہی ہیں۔ اصولاً یہ اور ان جیسی دوسری دستاویزات جو بھی فٹ پاتھ پر بکنے والی کتابوں کے اندر سے نکلتی ہیں، کبھی جن کے گٹھر کسی کباڑیے کے پاس رکھے نظر آجاتے ہیں ان سب کو دستاویزات کے لیے قائم کردہ اُن آرکائیوز میں ہونا چاہیے جو کروڑوں کے بجٹ سے بنائے جاتے ہیں مگر جن کا کاغذوں اور دستاویزات کو ڈھونڈنے، تلاش کرنے اور محفوظ بنانے کا کوئی ایسا مستقل نظام موجود نہیں ہے جو ان اداروں کو اعتبار سے ہمکنار کرسکے۔

آخر میں، میں 'مال گاڑی میں امانتیں' کے مرتبین کا مشکور ہوں کہ انہوں نے ایک اہم قومی خدمت سرانجام دی اور یہ تاریخی اہمیت کی کتاب شایع کی۔ آئندہ نسلیں بھی یقیناً اس کتاب کو تحسین کی نظروں سے دیکھیں گی۔

محمد حنیف بندھانی کے خطاب کے اقتباسات

سب سے پہلے تو میں اللہ تعالیٰ کے حضور انتہائی عاجزی سے شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اپنے عظیم والد چوہدری محمد اسماعیل کی امانتوں کی حفاظت میں سرخرو کیا۔ اور میں انہیں اپنے ہم وطنوں کے سامنے پیش کرسکا۔

یہ امانتیں صرف افسروں کی نہیں پاکستانی قوم کی امانتیں تھیں

77 سال ان قیمتی کاغذات کو سنبھال سنبھال کر رکھنا بہت مشکل تھا۔ اب تو ہمارے خاندان میں تیسری نسل اپنی ذمہ داریاں پوری کررہی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد انہیں بھی فخر محسوس ہورہا ہے کہ وہ ایک ایسی شخصیت کے پوتے پڑپوتے نواسے پڑنواسے ہیں۔ جس نے تاریخ پاکستان کا ایک بہت ہی بڑا چیلنج قبول کیا تھا کہ پاکستان سے وابستگی اور وفاداری کا اعلان کرنے والے افسروں کے سامان۔ کتابوں فرنیچر کو ایک غلام ملک کے دائرالحکومت کے ریلوے اسٹیشن سے ایک نوآزاد ملک کی ریلوے اسٹیشن تک لانے کا ٹھیکہ لیا۔ کتنے بلوے ہورہے تھے۔ فسادات ہورہے تھے۔ ریل گاڑیوں کو راستوں میں روکا جارہا تھا۔ پھر بھی وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر امانتیں۔ ان کے مالکوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

1946 میں جب ہندوستان کے بٹوارے کے منصوبے بننے لگے تو تعصبات اور قتل وغارت کے واقعات مسلمانوں کے خلاف ہونے لگے اور مسلمان اپنی حفاظت کیلئے راتوں کو جاگتے تھے۔ میری عمر اسوقت 10،9 سال کی تھی۔ دہلی میں ہماری رہائش ''ملتانی ڈھانڈا'' پہاڑ گنج میں تھی۔ ہماری پوری برادری ''بندھانی'' کے نام سے مشہور تھی جسے جفاکش بھاری وزن (3 من سے زیادہ) اٹھانے والا مزدور کہا جاتا تھا۔ یہ راجپوت برادری راجپوتانہ جودھپور سے دہلی آکر آباد ہوگئی تھی۔ شام کو گھر کے باہر مزدور جمع ہوجاتے تھے انکو روزانہ مزدوری دی جاتی تھی۔ مزدور مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ میرے ابا حضور برٹش حکومت کے بڑے ٹھیکیدار تھے۔ اسکے علاوہ وائسرائے ہند کے بھی خصوصی ٹھیکیدار تھے گرمیوں میں وائسرائے ہند شملا (شملہ) کشمیر شفٹ ہو جاتے تھے اس تمام کام میں شفٹنگ کا ٹھیکہ اور واپسی میرے والد کی ذمہ داری تھی۔

Carriage Contract۔14 اگست 1947 کو ابا نے دستخط کئے اور معاہدے کی تاریخ 15 اگست 1947 ہے جو لیٹر پر درج ہے۔ سرکاری طور پر PARTITION کا اعلان 15 اگست 1947 ہے۔ پاکستان گورنمنٹ کی طرف سے جناب اسکندر مرزا جو اسسٹنٹ سیکریٹری دفاع تھے۔ اور چودھری محمد علی جو اسسٹنٹ سیکرٹری خزانہ تھے۔ ذمہ دار تھے۔ آرمی کی طرف سے دہلی میں نگرانی کیلئے کرنل حق نواز جو بعد میں میجر جنرل اور بطور صدر پاکستان زرعی ترقیاتی بینک ریٹائر ہوئے، پنجاب امرتسر لاہور تک کی نگرانی کرنل ایوب خان کررہے تھے جو بعد میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر پاکستان رہے۔

ابا نے 14 اگست 1947 سے پہلے دہلی سے 25 افراد کراچی پاکستان روانہ کردیئے تھے۔ جو کینٹ اسٹیشن پر ڈیلیوری کے ذمہ دار بنائے گئے۔ باقاعدہ سامان (Goods) کی رسید لینے کے بعد متعلقہ افسر کو اس کا گھریلو سامان ڈیلور کرنا (وصول کروانا) بھی ان کی ذمہ داری تھی۔

دہلی سے کراچی پاکستان تک۔ ہر افسر کے گھر سے سامان لوڈ کرنا اور دہلی ریلوے اسٹیشن پر Unload کرنا پھر Inventory بنانا اور ریلوے کی بوگی میں Load کرنا پھر کراچی کینٹ اسٹیشن پر Unload کرنا اور متعلقہ افسر کو رسید لیکر Deliver کرنا یہ سب 11 آنے من میں طے ہوا۔ آپ معاہدہ پڑھ لیں۔ مجھے یہی یاد ہے۔

جب سکندر مرزا پاکستان کے صدر بنے اور کراچی کے ایوان صدارت میں غالباً 1956ء میں

حنیف بندھانی نوجوان وکلا کے ہمراہ

جامعہ کراچی شعبۂ اُردو کی ذکیہ رانی۔ اور شعبۂ اُردو کے طالب علم

غلطی ہو تو تصحیح فرمالیں۔ ابا مجھے لیکر ایوان صدارت پولوگراؤنڈ کے پاس جہاں ہم کرکٹ کھیلا کرتے تھے اُن کے سیکریڈی صاحبان سے ملے۔ ابا بیماری کی وجہ سے اور کچھ پریشانی کی وجہ سے کمزور ہوگئے تھے۔

ابا نے سیکرٹری صاحب کو کہا میں مرزا صاحب کا دوست ہوں۔ میرا یہ نام ہے۔ دہلی میں سن 1947 میں مرزا صاحب نے مجھ سے مبلغ 5000/- پانچ ہزار روپے قرض لئے تھے کہ پاکستان جاکر آپ کو لوٹا دونگا۔ مرزا صاحب کو بتائیں میں آیا ہوں۔ وہ فوراً مجھے بلالیں گے۔

سیکرٹری صاحب بڑی رعونت سے فرمانے لگے۔ بابا آپکی طبیعت ٹھیک ہے۔ دماغ ٹھیک ہے۔ صدر مملکت پر آپ الزام تراشی کررہے ہیں آپ نے اپنی حیثیت دیکھی ہے آپ مرزا صاحب

اسداللہ شاہ راشدی

بیرسٹر عابد زبیری

شکیل خان

حافظ ڈاکٹر جمیل بندھانی

مہر شاہ راشدی

کے دوست کیسے ہو سکتے ہیں۔اور وہ آپ سے قرضہ لیں گے۔

میں نوجوان تھا۔میٹرک کا طالب علم تھا۔غیرت نے جوش کھایا اور میں نے سیکرٹری کو سخت لفظوں میں مخاطب کیا کہ آپ کا کام ملاقات کرانا ہے۔کسی کو حقیر نہ سمجھیں۔

ابا نے مجھے ڈانٹ دیا۔خاموش رہو!

اسی دوران ایک شخص سفید وردی میں چاق و چوبند آیا اور ابا کو دیکھتے ہی کہا کہ چوہدری صاحب آپ کہاں ہیں۔مرزا صاحب آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔اس اردلی کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔

اس سے ابا نے پوچھا۔

''یہ بتاؤ، مرزا صاب ناشتے میں وہی دو انڈے کا آملیٹ کھا رہے ہیں'' وہ کہنے لگا۔''جی ہاں''

اور فوراً کہا کہ''میں صاحب کو بتاتا ہوں۔''

اب سیکرٹری صاحب معافیاں مانگنے لگے۔بڑے صاحب اپنے بیٹے کو سمجھائیں۔ہماری شکایت صدر صاحب کو نہ کردے آپ بھی معاف کردیں۔ہم سے بہت غلطی ہوئی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے رہے۔

ابا نے کہا میں نے معاف کردیا۔

میں نے کہا کسی انسان کو حقیر نہ سمجھو۔اگر ابا معاف نہیں کرتے تو میں ضرور شکایت کرتا۔

اتنے میں وہ اردلی واپس آیا کہ جلدی چلو مرزا صاحب آپ کو فوراً بلا رہے ہیں۔

صدر اسکندر مرزا ابا سے اٹھ کر اچھی طرح گلے ملے اور بار بار سوال کرتے رہے تم کہاں تھے۔مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے اور یہ کہ تمہاری صحت کو کیا ہو گیا ہے۔تم تو بہت طاقتور اور صحت مند انسان تھے۔

1956ء میں ابا کے کام کا بل -/29600 روپے منظور ہوا۔سرکار نے لکھوالیا کہ مزید کلیم داخل نہیں ہوگا۔

1947 کا اگست اب تک چلا آرہا ہے

پیسے۔روپے ملتے ہی ابا نے ان مزدوروں کو جو زندہ تھے اور دہلی میں کام کیا تھا۔گھروں سے بلا بلا کر انکی اجرت ادا کی اور رسید لکھوائی۔

لوگوں کو جب اطلاع ہوئی تو برادری۔خاندان کے لوگ روزانہ گھر آنے لگے۔کوئی 500 کوئی 1000 کوئی 2000 حتیٰ کہ 10000 ہزار روپے قرض مانگنے لگے کہ کاروبار کریں گے۔جلد واپس کردیں گے۔جن لوگوں۔رشتہ داروں کو قرض دیا وہ کسی نے واپس نہیں کیا کہ ہمیں نقصان ہو گیا ہے۔اس صدمے میں ابا بیمار ہو گئے اور مجھے انٹر سائنس کی تعلیم ترک کرنا پڑی۔اور نوکری کی تلاش شروع کردی۔

صبح اُٹھا۔فجر کی نماز کے بعد محلے کے ایک ہوٹل میں 'جنگ' اخبار اور 'انجام' اخبار آتا تھا۔صبح

حسینہ معین ہال میں سامعین کا انہماک

پڑھنے والوں کی لائن لگی ہوتی تھی۔
اخبار میں پڑھا کہ KMC میں کلرک کی نوکری کیلئے فلاں تاریخ کو تحریری امتحان ہے۔ٹیسٹ کیلئے درخواست چیف آفیسر مسٹر چھاگلہ کو دے دیں۔
دوسرا اشتہار ڈائریکٹر مردم شادی Census پاکستان سیکرٹریٹ گورنمنٹ آف پاکستان کا پڑھا۔
کلرک کیلئے درخواست دے دی۔
دونوں اداروں میں تحریری امتحان پاس کیا۔انٹرویو میں کامیابی ہوئی۔
میں نے دونوں اداروں میں جوائن کر لیا۔ K M C میں Cheif Assessor and Collector کے آفس کو جوائن کیا۔
مردم شماری میں ڈائریکٹر صاحب جو CSP افسر تھے اور بات چیت سے مجھے بہاری لگ رہے تھے کو جوائن کیا۔ میں نے ان کو بتایا کہ K.M.C میں بھی مجھے نوکری مل گئی ہے۔صبح سے 1 بجے تک ڈیوٹی ہے۔وہ فرمانے لگے استعفیٰ نہیں دینا آپ 2 بجے دوپہر سے ڈیوٹی پر آجایا کرو اور کسی کو نہیں بتانا کہ ڈبل نوکری کرتے ہو۔
پہلی تنخواہ ماں باپ کو دی تو ابا ناراض ہو گئے۔تم نے تعلیم چھوڑ دی۔ماں نے سمجھایا ابا راضی ہو گئے۔فرمانے لگے بیٹے 6 ماہ میں تمہاری شادی کر دینگے۔
ایک دن اخبار میں دیکھا کہ نیشنل بنک آف پاکستان میں کلرک کی نوکری آئی ہے۔امتحان میں بیٹھ گیا۔100 نمبر کا پرچہ تھا۔3 سوال حساب یعنی سود-%اور Average باقی جنرل معلومات۔100 میں سے 90 نمبر حاصل کئے۔انٹرویو ہوا۔اور مجھے کلرک کی نوکری مل گئی پہلی posting نکل روڈ برانچ ایوان تجارت نزد سندھ مدرسۃ الاسلام ہوئی اور میں K.M.C، Cheif Assessor and Collector کے پاس اپنا استعفیٰ لیکر پہنچا تو مجھے شفقت سے کہا کہ میں نے تم کو دوسری نوکری دے دی ہے۔اب تم Collector-TAX Tapedar بن گئے ہو۔پہلے جس جگہ پر تم کام کر رہے تھے وہ لڑکا نوکری پر بحال ہو گیا ہے۔
میرے علم میں ہی نہیں تھا کہ میری نوکری ختم ہو گئی ہے۔میں تو استعفیٰ دینے گیا تھا۔اللہ تعالیٰ نے جو عالم الغیب ہے میرے رزق کا پہلے ہی بندوبست فرما دیا۔

حنیف بندھانی اور محمود شام لائق مبارکباد کہ امانتیں محفوظ ہو گئیں۔ڈاکٹر سید جعفر احمد

یہ ہے توبہ کا اثر اور صرف مدد رب العالمین سے مانگنا!
میرے لئے گورنمنٹ آف پاکستان کے لیبر کمشنر خواجہ صاحب جو انڈیا میں کلرک تھے اور ابا کے دوست تھے۔انہوں نے کئی اداروں کو خط لکھے لیکن کہیں سے جواب تک نہیں آیا۔
میں نے بنک کی نوکری کے دوران شام کو S.M Law College جوائن کیا۔اور 2 سال میں لاء گریجویٹ بن گیا۔
بنک کی نوکری کے دوران مجھے N.B.P کی بیرون ملک Foreign Branches کا آڈٹ کرنے کا بھی شرف حاصل ہے۔

1- Hong Kong Branch
2- Osaka Branch
3- Tokyo Japan Branch
4- South Korea

Foreign Audit کیلئے TA, DA ڈالر میں ملتا ہے۔
بلوچستان کی بھی تقریباً ساری NBP کی برانچوں کا آڈٹ کیا۔اس زمانہ میں حالات انتہائی پر امن تھے۔

میرے ابّا جان جان خطرے میں ڈال کر امانتیں اپنے مالکوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔محمد حنیف بندھانی ایڈووکیٹ

سندھ کی بھی تقریباً تمام بڑی برانچوں کا آڈٹ کیا۔یہاں TA, DA سے جو آمدنی ہوئی میں نے 6 بیٹوں اور 4 بیٹیوں کی شادی کی۔
آخر میں عرض کروں کہ یہ کتاب کبھی منظر عام پر نہ آتی اگر ہجرت اور تقسیم ہند کے معاملات پر جناب محمود شام کا کالم 'جنگ' میں، میں نے نہ پڑھا ہوتا۔میں نے سوچا کہ ابا حضور کے ٹھیکے کے سلسلے میں جن دستاویزات کو میں اب تک سنبھالتا آ رہا ہوں ان کے بارے میں صائب مشورہ یہ صاحب ہی دے سکتے ہیں۔ان کے کہنے پر میں یہ کاغذات ان کے پاس لے گیا۔ان دستاویزات کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں جو روشنی میں نے دیکھی۔میں حیرت زدہ رہ گیا۔سب سے پہلے تو انہوں نے ان بوسیدہ کاغذات کو محفوظ کروایا۔پھر ان کو ترتیب دیا۔مجھے ایک ولولۂ تازہ دیا کہ میں بھی اپنی یادداشتیں قلمبند کروں یوں یہ ایک تاریخی کتاب وجود میں آ گئی۔آج جس کی رُونمائی ہو رہی ہے۔ ❁

مصنف حنیف بندھانی اپنے اہل خانہ کے ہمراہ

تذکرہ کتابوں کا

خان ظفر افغانی اس بار بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں کا تذکرہ لے کر آئے ہیں۔ بچوں کے لیے لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ کیونکہ ان کی عمر کے مطابق الفاظ کا چُناؤ۔ ان کی تصنیفات کے مطابق کہانی کا آغاز انجام۔ خان ظفر افغانی کتابوں کے دلدادہ ہیں۔ کتابیں پڑھتے ہیں۔ خریدتے ہیں۔ اچھی کتابوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ماہنامہ 'اطراف' کا یہ سلسلہ ادبی علمی حلقوں میں بہت پسند کیا جارہا ہے۔ قارئینِ 'اطراف' بے تابی سے انتظار کرتے ہیں کہ 'اطراف' میں اس بار کونسی کتابیں زیرِ تذکرہ ہوں گی۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔

''نیلے پہاڑوں کا راز'' بچوں کے لیے سیّد عرفان علی یوسف کا تحریر کردہ ناول

☆ خان ظفر افغانی

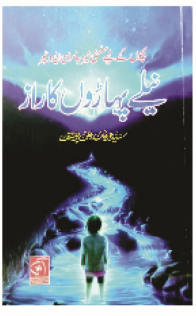

زیرِ تذکرہ کتاب کے مصنف' سید عرفان علی یوسف کہنہ مشق صحافی ہیں۔ مختلف روزناموں سے وابستہ رہے ہیں۔ جامعہ کراچی اور گورنمنٹ کالج بارکھان بلوچستان میں صحافت اور تاریخ کی تدریس کی ہے۔ اُردو کالج اور وفاقی یونیورسٹی میں اعزازی پروفیسر رہے۔ قائداعظم اکیڈمی کراچی میں ریسرچ فیلو رہے۔ ''مقتدرہ قومی زبان'' میں معاون عمرانی علوم، این ای ڈی یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی میں افسر تعلقات عامہ رہے۔ ''آج ٹی وی چینل''، میں نیوز پروڈیوسر کے طور پر کام کیا۔ ابلاغ عامہ پر دو درسی کتابیں تحریر کی ہیں۔ صحافت اور تاریخ عام، میں ایم اے کی اسناد حاصل کی ہیں۔

لیکن سب سے بڑھ کر، وہ کمال کے ترجمہ نویس ہیں۔ ان کے کیے گئے تراجم کو پڑھتے ہوئے یہ شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ ترجمہ پڑھا جارہا ہے۔ ترجمے میں سلاست، روانی، جملوں کی بُنت انتہائی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ماہنامہ 'اطراف' کے آغاز سے ہی وہ اس سے وابستہ ہیں۔ کتنی ہی انگریزی زبان کی کتابوں کے تراجم 'اطراف' کے صفحات کی زینت بن چکے ہیں۔ بے شک الدرب الکریم نے انہیں لکھنے اور ترجمے کی قابل تحسین وقابل رشک صلاحیت سے نوازا ہے۔ بلا مبالغہ سینکڑوں کتابوں کا انہوں نے ترجمہ کیا ہے۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بچوں کے لیے کہانیاں اس وقت سے تحریر کررہے ہیں جب وہ خود بچے تھے۔ میٹرک تک وہ، بچوں کے لیے دو ناول تحریر کرچکے تھے۔ بچوں کے کئی معروف جرائد میں عرفان علی یوسف کی تحریر کردہ درجنوں کہانیاں شائع ہوچکی ہیں۔

تحریر، تالیف وترجمے میں، ماشاءاللہ ان کا سفر جاری ہے۔

''نیلے پہاڑوں کا راز'' بچوں کے لیے عرفان علی یوسف کا پہلا ناول ہے جو 109 صفحات پہ مشتمل ہے۔ یہ پانچ ابواب ''قلندر بابا، کالی بلی، بوڑھا برگد، مجرموں کے تعاقب میں' پولیس آپریشن میں بیان کیا گیا ہے۔

''ادارۂ تصنیف وترجمہ'' (گلستانِ جوہر کراچی) کے تحت اسے معروف ناشر ''آس پبلی کیشنز'' (اُردو بازار، کراچی) نے ناول کو شائع کیا ہے اور قیمت ہے 600 روپے۔

''بڑھتے چلو.....'' علی حسن ساجد کے، بچوں کے لیے تحریر کردہ ڈرامے

اللہ تعالیٰ جب کسی کو نوازتا ہے تو کیسی کیسی صلاحیتیں عطا کرتا ہے، کیسے کیسے اعزازات سے مالا مال کردیتا ہے، عزت بخشتا ہے، شہرت سے نہال کرتا ہے۔ اور یہ سب کچھ مجسم دیکھنا ہو تو علی حسن ساجد سے ملیے۔

وہ جب سے لکھ رہے ہیں جب وہ بچے تھے، کالج میں تھے تو اس کے مجلّے کے مدیر تھے۔ خالقہ ینابال لائبریری ایسوسی ایشن کے صدر ہوئے، اسٹوڈنٹس ویلفیئر آرگنائزیشن کے فعال عہدے دار رہے، پاکستان ٹیلی وژن سے بحیثیت نیوز ریڈر طویل وابستگی، ادبی، سماجی، سرکاری تقریبات میں کمپیئرنگ، گورنر سندھ کے پریس سیکرٹری بھی رہے، بلدیہ عظمیٰ کراچی کے سینئر ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز اینڈ میڈیا مینجمنٹ ہیں، اخبار بلدیہ کے مدیر ہیں، بچوں کے جریدے ''جنگل منگل'' کے بانی وروح رواں ہیں۔

انہی علی حسن ساجد نے بچوں کے لیے ڈرامے تحریر کیے ہیں جو کتابی شکل میں ''بڑھتے چلو'' کے نام سے ''چلڈرن فاؤنڈیشن'' (کراچی) نے شائع کیے ہیں، مضبوط جلد اور دیدہ زیب سرورق، قیمت ایک ہزار روپے، صفحات ہیں ایک سو گیارہ۔

اس کتاب کا دیباچہ حنیف سحر نے تحریر کیا ہے جو خود بھی بچوں کے ادیب ہیں، ساتھ ہی بڑوں کے بھی، ٹی وی ڈرامے تحریر کرتے ہیں اور تنقیدی تبصرہ

نگار بھی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ علی حسن ساجد اور حنیف سحر، بچپن کے دوست ہیں اور اس دوستی کی بنیاد اس وقت پڑی جب یہ دونوں، بچوں کے جریدے ''ٹوٹ بٹوٹ'' (کراچی) میں یکجا ہوئے تھے۔ اس جریدے سے ان دونوں نے لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ یہ جریدہ، ملک کے معروف صحافی، شاعر، ادیب، کالم نویس محمود شام صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ وہی اس کے بانی اور ناشر تھے اور اب وہ ماہنامہ 'اطراف' کے بانی، ناشر و چیف ایڈیٹر ہیں، کئی درجنوں کتابوں کے مصنف و مولف۔

حنیف سحر اپنے دوست کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''میں نے اسے ہمیشہ رزم گاہ ہستی میں برسرِ پیکار ہی دیکھا ہے۔ آج وہ جو کچھ بھی ہیں جہاں تک بھی آسمان اس کا ہے۔ یہ سب اسے کسی نے پلیٹ میں رکھ کر نہیں دیا۔ وہ چاندی کا چمچہ لے کر پیدا نہیں ہوا۔ اس نے جو کچھ بھی حاصل کیا جو کچھ بھی کمایا اور جو اس کا ہے، وہ سب کڑی محنت، جفاکشی اور روز افزوں ریاضت کی وجہ سے ہی ممکن ہو پایا۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نے یہ سب ایسے ماحول ایسے سماج میں کیا جہاں صلاحیتوں کا خون پینے والے بھیڑیے دن رات منہ کھولے سب کچھ ہڑپ کرنے کو تیار بیٹھے رہتے ہیں۔

ہزاروں لاکھوں میں کتنے ہوتے ہیں ایسے شہسوار جو جنگ جیت کر فتح یابی کا جھنڈا اٹھائے تمکنت سے سر اونچا کیے کر سکتے ہوں کہ سرخ رُو ہوا ہوں اور یہ میرے اکیلے کی جیت نہیں، میری فیملی اور ان ہزاروں لوگوں کی جیت ہے جو ایک قافلے کی صورت میرے ساتھ رہے۔ یقین جانئے علی حسن ساجد میں یہ کہنے کا حوصلہ ہے۔ اس نے روشنی کا راستہ چُنا اور وہ چمک رہا ہے۔ پیچھے گزرے ہوئے وقت کی ساری توانائی کے ساتھ۔''

علی حسن ساجد کی زیرِ تذکرہ کتاب خود میں سات ڈرامے سموئے ہوئے ہے: بڑھتے چلو، بورڈنگ ہاؤس، عید کا دن، لیموں کی قیمت، ہیروں کی کان، قاضی کا انصاف، رہنما خواب۔

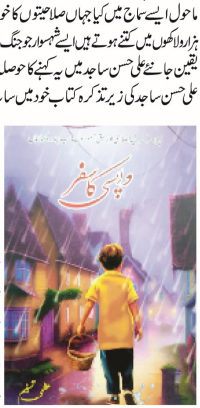

''واپسی کا سفر'' بچوں کے لیے عظمیٰ تسنیم کی تحریر کردہ کہانیاں

عظمیٰ تسنیم، تقریباً تین عشروں سے بچوں کا ادب تحریر کر رہی ہیں۔ زیرِ تذکرہ کتاب اصلاحی، سبق آموز، دلچسپ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ مصنّفہ کا کہنا ہے کہ ''یہ کہانیاں مستقبل کے ان معماروں کو نظر میں رکھتے ہوئے تحریر کی گئی ہیں جنہوں نے کٹھن حالات کو اپنے قدموں کی زنجیر نہیں بنایا بلکہ عزم و ہمت، ایثار و محبت اور جہد و جہد کے عمدہ اوصاف سے مزین ہو کر مشعل راہ بنے۔ ان کہانیوں کے مرکزی کردار میری قوم کے بچوں کو ان ہی اعلیٰ اوصاف کا سبق دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہانیاں بہت دل سے لکھی گئی ہیں اور میرے دل کے بہت قریب ہیں۔''

128 صفحات پر مشتمل، کہانیوں کی اس کتاب کو محمد فہیم عالم نے ''بچوں کا کتاب گھر'' (ہادیہ حلیمہ سینٹر، عربی اسٹریٹ، اُردو بازار لاہور) کے زیرِ اہتمام شائع کیا ہے۔ قیمت ہے 500 روپے۔ ماہنامہ رابطہ کے سابق اور ماہنامہ ساتھی کراچی کے بانی مدیر کلیم چغتائی، تنزیلا احمد اور دانیال حسن چغتائی کی آراء کتاب کی زینت ہیں۔

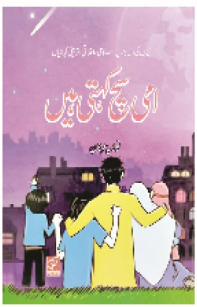

''امی سچ کہتی ہیں'' فوزیہ عرفان کی بچوں کے لیے کہانیاں

112 صفحات، 18 کہانیاں، بڑے سائز اور سفید کاغذ پر طبع یہ کتاب معروف ناشر ''آس پبلی کیشنز'' (اُردو بازار کراچی) نے شائع کی ہے۔ قیمت ہے 800 روپے۔

فوزیہ عرفان اپنے پیش لفظ میں کہہ رہی ہیں کہ ''میری نظر میں اپنے معاشرے کے بچوں کی کردار سازی کے حوالے سے کیا ہوا کام دنیا کے بہترین کاموں میں سے ایک ہوتا ہے کیونکہ بچے ایک صاف تختی کی مانند ہیں، جو چاہو اس پر لکھ لو۔ میں نے اپنی زندگی سے اس بات کو جانا ہے کہ مثبت کہانیاں، بچوں کی زندگیاں بدل دیتی ہیں۔ لہٰذا یہ تمام باتیں، اس کتاب کو لکھنے کا باعث بنیں، جس میں مجھے اپنے کئی اہداف پورے ہوتے نظر آ رہے ہیں۔''

خالد دانش اور لبنیٰ غزل کی آراء اس کتاب میں شامل ہیں۔

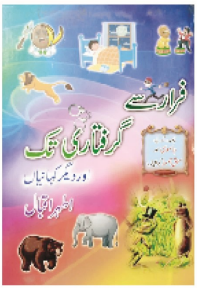

''فرار سے گرفتاری تک'' اطہر اقبال کی کہانیاں

اطہر اقبال معروف ادیب و شاعر ہیں، بچوں کے ادب سے خصوصی لگاؤ ہے۔ ان کی تحریر کردہ کتاب ''ایک کہاوت ایک کہانی'' کو نیشنل بک فاؤنڈیشن نے انعام سے نوازا۔ اس کے علاوہ ان کی کتابیں 'ایک محاورہ ایک کہانی، ریڈیائی خاکے، جھیل سیف الملوک، سوات سواد' شائع ہو چکی ہیں۔ مختلف سرکاری اداروں میں بڑے عہدوں پر کام کرتے رہے ہیں۔

زیرِ تذکرہ کتاب 'فرار سے گرفتاری تک' مختلف کہانیوں اور کہاوتوں پر مشتمل ہے۔ اس کے 174 صفحات ہیں۔ اسے معروف ناشر فرید حسین نے فرید پبلشرز کے زیرِ اہتمام شائع کیا ہے، قیمت ہے 800 روپے۔

معروف و کہنہ مشق ادیب، شاعر و صحافی جناب محمود شام کی رائے میں ''اطہر اقبال کی کہانیوں میں یہ خیال بھی رکھا جاتا ہے کہ یہ کہانی کس عمر کے بچے کے لیے ہے، اس کے ذہن میں کون سے الفاظ زیادہ آسان کہے جائیں گے۔ ہر کہانی میں پڑھنے والے بچوں کی عمر کے مطابق الفاظ بھرے جاتے اور جملوں کی ساخت بھی بہت سادہ رکھی جاتی انہیں زیادہ طوالت نہ دی جاتی۔ بچوں کے ساتھی، انسانوں سے محبت کرنے والے اطہر اقبال ایک اور نئی کتاب ''فرار سے گرفتاری تک' لے کر آ گئے ہیں۔ بچو! آئیں اطہر اقبال صاحب کو مبارکباد بھی دیں اور شکریہ بھی کہ انہوں نے بچوں کے ادب میں اتنی پیاری پیاری نصیحت بھری کہانیوں کا اضافہ کیا ہے۔''

’’جگنو‘‘ کاوش کا بچوں کے لیے تحریر کردہ ناول

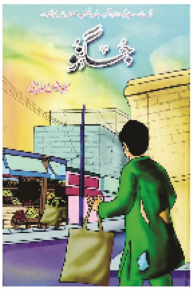

176 صفحات پہ پھیلا ہوا یہ ناول معروف ادیب کاوش صدیقی کا تحریر کردہ ہے۔ اس سے پہلے بچوں کے لیے تحریر کردہ ان کا ناول ’’سرمد‘‘ شائع ہو چکا ہے۔
کاوش صدیقی نے بتایا ہے کہ ’’جگنو ایک مزدور بچے کی کامیاب زندگی کی ایسی داستان ہے جو آپ کو چونکا دے گی‘ ہنسائے گی اور کبھی رلائے گی۔ میری آرزو ہے کہ میرے وطن کا ہر بچہ مثل ’جگنو‘ ہو جائے۔ ہر مزدور بچے کا مستقبل ایسا ہو جائے کہ ہر بچہ ’جگنو‘ بننے کی آرزو کرے۔‘‘
دیدہ زیب سرورق سے مزین‘ مضبوط جلد میں گندھا ہوا یہ ناول، معروف ناشر محمد فہیم عالم نے ’’بچوں کا کتاب گھر‘‘ (ہادیہ حلیمہ سینٹر، غزنی اسٹریٹ، اُردو بازار، لاہور) کے تحت شائع کیا ہے۔ اس کی قیمت ہے 700 روپے۔

’’بہار پری‘‘ بچوں کے لیے بہترین وشاہکار 70 کہانیاں، نذیر انبالوی کا انتخاب

اُردو ادب کے معروف ادیبوں نے بچوں کے لیے جو کہانیاں تحریر کی ہیں اور جو بچوں کے مختلف جرائد میں شائع ہوئیں، ان میں سے بہترین اور شاہکار 70 کہانیوں کا انتخاب، معروف ادیب نذیر انبالوی نے کیا ہے اور انہیں کتابی شکل میں یکجا کر کے ’’بہار پری‘‘ کے نام سے ’’بچوں کا کتاب گھر‘‘ نے شائع کیا ہے۔ 336 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ہے 800 روپے۔
70 کہانیوں کے نام اور ان کے لکھنے والوں کے نام تو یہاں پیش کرنا، تنگی داماں کی وجہ سے ممکن نہیں۔ لیکن یہ مشہور لکھاری ہیں جیسے احمد ندیم قاسمی، سعید لخت، احمد فراز، میرزا ادیب، اختر وقار عظیم، حنیف رامے، حفیظ جالندھری، اے حمید، نصر اللہ خان، سید قاسم محمود، کمال احمد رضوی۔
نذیر انبالوی نے بہترین کہانیوں کو تلاش کر کے، ان کا انتخاب، کتابی شکل میں پیش و محفوظ کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ یہ محنت طلب، وقت طلب کام ہے اور مسلسل ہے۔ اب تک اس طرح کی آٹھ کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں تقریبا 400 کہانیوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اب اس سلسلے کو ’’بچوں کے ادب کی الف لیلہ‘‘ کا نام دیا گیا ہے۔ زیر تذکرہ کتاب، اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے۔

’’گوگلی سب جانتی ہے‘‘ بچوں کے لیے وجیہ وارثی کا ناول

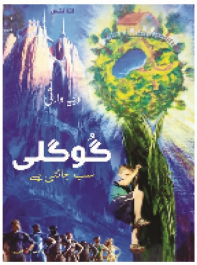

زیر تذکرہ ناول کے ناشر فاروق احمد کہتے ہیں کہ ’’بچوں کے لیے یہ ایک سیدھا سادہ دلچسپ ناول ہے جسے وہ ایک ہی نشست میں پورا پڑھنا چاہیں گے۔ وجیہ کے ناول اصل معنوں میں آٹھ سے اسّی سال تک کے بچوں کے لیے ہیں۔‘‘
وجیہ وارثی بچوں کے معروف ادیب ہیں۔ یہ ان کا دوسرا ناول ہے۔ اس سے پہلے، ان کا تحریر کردہ ناول ’’جنگلستان‘‘ شائع ہوا تھا جو بچوں میں بہت پسندیدہ رہا۔
123 صفحات پر پھیلا ہوا یہ ناول ’’اٹلانٹس پبلی کیشنز‘‘ کے تحت شائع ہوا ہے اور قیمت ہے 400 روپے۔

’’چھٹی کا ایک دن‘‘ بچوں کے لیے شازیہ فرحین کی کہانیاں

شازیہ فرحین نے بچوں کے لیے تحریر کردہ اپنی 25 کہانیاں، اس ایک کتاب میں پیش کی ہیں۔ معروف صحافی، جامع کراچی کے شعبۂ ابلاغ عامہ کے سابق چیئرمین اور صحافی ڈاکٹر طاہر مسعود کا کہنا ہے کہ شازیہ فرحین کی یہ کہانیاں بچوں کے پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہر کہانی کے اندر ایک پیغام ہے۔ کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق ہے جو پڑھنے والے کو سوچنے پر مجبور کر کے اس سے کوئی نہ کوئی نتیجہ اخذ کرنا سکھاتی ہے۔ ان کی ساری کہانیوں میں ہمیں ایک ہی پیغام سنائی دیتا ہے کہ زندگی اور رشتوں کو خوبصورت ہونا چاہیے۔‘‘
معروف اساتذہ اور ادیبوں محمد فیصل علی اور منیر احمد راشد کی آراء بھی کتاب کی زینت ہیں۔
زیر تذکرہ کہانیوں کی کتاب، بچوں کا کتاب گھر کی اشاعت کردہ ہے، اس کے 160 صفحات ہیں اور قیمت ہے 600 روپے۔

اطراف لاؤنج

کراچی پریس کلب

شعیب احمد
سیکرٹری
کراچی پریس کلب

کراچی پریس کلب کے موجودہ نومنتخب سیکرٹری شعیب احمد۔ عامل صحافی ہیں۔ صحافیوں کے حقوق، میڈیا کی آزادی کے لیے سرگرم، کراچی پریس کلب کی تعمیر وترقی کے لیے ہروقت مستعد۔ پریس کلب کو پرنٹ میڈیا۔ الیکٹرانک میڈیا سب کے کارکنوں کا ثقافتی۔ پیشہ ورانہ مرکز بنانے کے لیے پیش پیش۔

'اطراف'، کا ایک مقبول سلسلہ دوبارہ شروع کیا جارہا ہے۔ آپ بھی اپنی تصاویر اور تعارف بھیج سکتے ہیں۔ 0300-8210636

بن احسان گرین سٹی۔نمائش اور جشن آزادی

”بن احسان، ایسوسی ایٹس اور حلقہ ’اطراف‘ کے درمیان علمی ادبی تعمیری روابط بہت خلوص سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایکسپو سینٹر حسن اسکوائر کراچی میں مائی کراچی کی نمائش میں ’اطراف‘ کی خصوصی اشاعت عوام میں بہت پسند کی گئی۔ پھر 13 اگست کو بن احسان کے صدر دفاتر میں یوم آزادی کی تقریبات بن احسان اور ’اطراف‘ ساتھ ساتھ تھے۔ محمد آصف صاحب نے نمائش اور تقریب آزادی کی رپورٹ بہت محبت سے قلمبند کی ہے۔“

”گھر آپ بنائیں۔ پیسہ ہم دیں گے“

تحریر: محمد آصف، ہیڈ مارکیٹنگ ’اطراف‘

کراچی ٹول پلازہ سے 30 کلومیٹر کے فاصلے پر چند سال قبل شروع کی گئی ہاؤسنگ سوسائٹی ’بن احسان گرین سٹی فیز ون‘ نے کراچی اور حیدرآباد کے عوام کے لیے انتہائی کم قیمت پر انتہائی قابل بھروسہ

اپنا پلاٹ صرف ایک ہزار میں بن احسان سے لیں

منصوبہ پیش کیا۔ اس منصوبے نے نا صرف عوام الناس کو اپنی جانب متوجہ کیا بلکہ ان کے اس عزم ”گھر آپ بنائیں۔ پیسے ہم دیں گے“ نے بھی بے انتہا مقبولیت حاصل کی۔ صرف ڈیڑھ سال کے مختصر عرصے میں ہی ”بن احسان گرین سٹی فیز ون“ نے پلاٹوں کی مکمل فروخت کے ساتھ فیز 2 پر توجہ مرکوز کردی ہے اور تعمیراتی کام بھی ساتھ ساتھ تیزی سے جاری ہے۔

2 سے 4 اگست تک ایکسپو سینٹر کراچی میں منعقد ہونے والی کنزیومر نمائش ’مائی کراچی 2024‘ میں گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی بن احسان گرین سٹی نے اپنا منفرد طرز کا اسٹال نمائش کے لیے پیش کیا۔ اس نمائش میں بھی بن احسان گرین سٹی نے ایک آزادی آفر عوام کے لیے پیش کی ”آپ اپنا پلاٹ صرف ایک ہزار میں بن احسان سے لے سکتے ہیں“ جسے عوامی سطح پر بہت پذیرائی ملی۔ اور عوام نے ریکارڈ بکنگ کروائی۔

اس موقع پر بن احسان کے سی او اور جناب فہد احسان نے ’اطراف‘ کو بتایا کہ انشاءاللہ بہت جلد بن احسان ایسوسی ایٹس اپنے لوگوں کے لیے بن احسان گرین سٹی اور بن احسان گرین ویلی (جو سپر ہائی وے پر ایم 9 کے اختتام پر واقع ہے) بھی عوام کے سامنے پیش کریں گے۔

انہوں نے کہا کہ ذاتی گھر کی خواہش ہر انسان کا فطری تقاضا ہے، پاکستان کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ آبادی والے شہر

نمائش میں بن احسان کے اسٹال پر عوام کا رش اور ریکارڈ بکنگ

جسے دنیا بھر میں میگا سٹی یا میٹروپولیٹن سٹی مانا جاتا ہے، میں گزشتہ 4 دہائیوں سے تعمیراتی شعبوں سے وابستہ کاروباری حضرات کی جانب سے پیش کردہ بے شمار تعمیراتی منصوبے اپنے دعووں کے برعکس عوام الناس کو لاکھوں کروڑوں روپے وصول کرنے کے باوجود ان کی خواہشات اور معیار کے مطابق سو فیصد مطمئن نہیں کر سکے ہیں۔

ایسے میں ہم نا صرف لوگوں سے کیے ہوئے اپنے وعدوں کو حقیقت کی شکل دے رہے ہیں بلکہ انسانی بنیادوں پر کئی فلاحی منصوبے بھی شروع کر رہے ہیں۔جس کی ایک مثال ڈاکٹر عبدالقدیر خان اسپتال اور 7 ہزار گز پر مشتمل ایک مسجد و مدرسہ بھی ہے۔

ہم اپنے پروجیکٹ پر ترجیحی بنیادوں پر تعمیراتی کام مکمل کر رہے ہیں تا کہ ڈویلپمنٹ چارجز کی مد میں عوام پر بوجھ نہ پڑے۔

ایکسپو سینٹر میں نمائش کے حوالے سے انہوں نے بتایا کہ گزشتہ سالوں کی نسبت اس سال عوامی پذیرائی بہت زیادہ ہو رہی ہے۔ لوگوں نے بہت پیار اور محبت دی۔اور ہم نے ریکارڈ بکنگ کی ہے

بن احسان ایسوسی ایٹس کے ہیڈ کوارٹرز میں 13 اگست کو یوم آزادی کی شاندار تقریبات

اور انشاءاللہ ہم اپنے خریداروں کی توقعات پر پورا اتریں گے اور بن احسان کی جانب سے ہونے والی تیز ترین آباد کاری کوششوں نے عام لوگوں کے لیے اس پٹی پر دلچسپی بڑھا دی ہے۔

13 اگست کو بن احسان بلڈرز اینڈ ڈویلپرز کے رجسٹرڈ آفس میں یوم آزادی کا کیک کاٹنے کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔

جس میں ماہنامہ 'اطراف' کے چیف ایڈیٹر محمود شام نے اپنی فیملی اور اسٹاف سمیت شرکت کی۔'اطراف' کے مارکیٹنگ ہیڈ محمد آصف، فوٹو گرافر شکیل قریشی، ایڈمن انچارج راجہ شاہد، اور بن احسان کے اسٹاف، مارکیٹنگ اور ڈائریکٹرز اور پارٹنرز نے سبز اور سفید لباس میں ہر مرحلے پر دلچسپی کا اظہار کیا۔

فہد احسان نے ان پُر مسرت لمحات میں یوم آزادی پر پیغام دیتے ہوئے کہا کہ آزادی کی نعمت سے سرفراز ہوئے ہمیں 77

بن احسان گرین سٹی۔ نمائش اور جشن آزادی

سال ہوگئے ہیں اور ہم قدم بہ قدم ترقی کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ گو کہ ترقی کی رفتار وہ نہیں ہے جو ہونی چاہئے مگر پھر بھی ہم دیگر قوموں سے بہت بہتر ہیں۔

انہوں نے مزید کہا کہ ہم نے گزشتہ سال محمود شام صاحب کے ساتھ یوم آزادی منایا تھا۔ اس سال بھی وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ موجود ہیں۔ آئندہ بھی انشااللہ ہم سفر رہیں گے۔

ہم انشااللہ بہت جلد ''بن احسان گرین سٹی فیز ون میں ''محمود شام بلاک'' کا افتتاح کریں گے۔ جس میں صحافت اور ادب سے تعلق رکھنے والے احباب کو انتہائی کم قیمت پر پلاٹ دے رہے ہیں۔ بن احسان کا عزم ہے کہ لوگوں سے کیے ہوئے اپنے وعدوں کو طے شدہ وقت سے قبل اور ان کی امیدوں سے ہزار گنا بہتر انداز میں پورا کریں۔ ان کے خوابوں کو تعبیر دے کر اپنے لوگوں اور خاص طور پر اللہ کے حضور سرخرو ہوں۔

آخر میں محمود شام صاحب کے پوتے رامید محمود اور نہدا احسان نے یوم آزادی کا کیک کاٹا۔ اور اسٹاف و دیگر حاضرین نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا۔

محمود شام نے 'اطراف' 14 اگست کے بیچ بن احسان کے حضرات اور بیگم محمود شام نے خواتین کو لگائے۔ باسل محمود بھی تصویر میں نظر آرہے ہیں

''پاکستان لائبریری'' کا وطن عزیز میں قیام

101 کتب جن کی مالیت دو لاکھ روپے ہے صرف تیس ہزار روپے (Rs:30,000) میں حاصل کریں۔ پاکستان لائبریری کے نام سے اپنے گھر، محلے، گاؤں، ہسپتال، جیل خانہ جات، کالونی، سکول، کالج، یونی ورسٹی میں اور اپنی اپنی مادرِ علمی میں، اپنے والدین، قومی ہیروز اور اپنے پیاروں کے نام پر یہ کتب خرید کر لائبریری قائم کریں۔

نوٹ: 100 خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم لائبریریوں کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے۔

قدم بڑھائیں، لائبریری بنائیں
کتابیں ایک سوایک، مقصد اعلیٰ اور نیک

قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

یثرب کالونی، بینک سٹاپ، والٹن روڈ، لاہور کینٹ

0300-0515101 / 0309-4105484 qalamfoundation2@gmail.com :ای میل

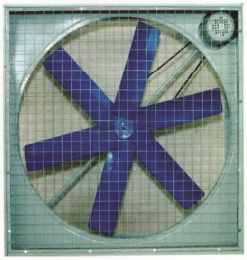

Bolan Fans
Bolan FAN TM
Pioneer Of Trolley Type Fan In Pakistan
www.bolanfan.com
Air Supply Fan
Trolly Type Belt Drive
Exhaust / Ventilating
Fan Belt Drive
Let's Make Environment Better
SIZE HP
48" 1.5
Let's Make Environment Better
SIZE HP
48" 1.5
Registered Design No. 17949-D By: Patent Office
Single / 3-Phase
Axis Industries
D-216, S.I.T.E. Karachi. Cell: 0324-8294509
0334-2979817, 0301-2919740
E-mail :bolanfan2000@yahoo.com
E-mail :axisindustries999@gmail.com
PS:ISO 5801/2017
Pakistan Standards
License No.CSDC/L-250/2019®
(A.C. Air Supply Industrial Bolan Fan)
CERTIFIED BY PSQCA

Bridging Extremes Monthly "ATRAAF" Karachi September 2024
Regd No. MC - 1398 ☎ 0300-8210636 ✉ www.Atraafmagazine.com

BIN AHSAN
Builders & Developers

BIN AHSAN GREEN CITY PHASE-I

PROJECT OF BIN AHSAN BUILDERS AND DEVELOPERS

اعتماد کی دنیا میں بڑا نام بن احسان

بن احسان گرین سٹی میں ترقیاتی کاموں کا آغاز ہو چکا ہے، 120 گز کے پلاٹ پر خصوصی رعایت
کے لیے رابطہ کریں اور آج ہی اپنا پلاٹ بک کرائیں۔ اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ بنائیں۔

A PIECE OF LAND
THAT EVERYONE CAN AFFORD !

MEMBER OF: abad

Universal Account Number : 03-111-155-530
www.binahsanbuildersanddevelopers.com

HEAD OFFICE LOCATION : OFFICE # 59,60 1ST FLOOR JABL-E-REHMAT TOWER ,GULISTAN-E-JAUHAR BLOCK 16A